PDF Compressor Free Version

# زبان و ادب

بہار اردو اکادمی کا ماہانہ مجلّہ


نائب صدور

جناب سلطان اختر

ڈاکٹر اعجاز علی ارشد

مدیر

مشتاق احمد نوری

سکریٹری، بہار اردو اکادمی

Mob. 09431080070

معاون مدیر

انوار محمد عظیم آبادی

جلد: ۳۷ شمارہ: ۸

اگست ۲۰۱۶ء

زرتعاون : دس روپے

سالانہ : سو روپے

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ : سکریٹری بہار اردو اکادمی، اردو بھون، چوہٹہ، اشوک راج پتھ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴ (بہار)

email : zabanoadabbua@gmail.com
buapat2014@gmail.com

فیکس/فون: 0612-2678021 - 2301476

Web : www.biharurduacademy.org

کمپوزنگ : پروین اشرفی

تزئین : زیبا پروین

PDF Compressor Free Version

# ترتیب


اداریہ

حرف آغاز — مدیر — ۳

مقالات

سردار جعفری کی تنقید: نظری اور عملی موقف کی کش مکش — ابوالکلام قاسمی — ۵

حضرت مولانا محمد بشارت کریم گڑھولویؒ اور علمائے متوسلین — پروفیسر محمد طیب صدیقی — ۱۱

تخلیقیت اور شاعری کا طلسم — پروفیسر قدوس جاوید — ۱۶

پورنیہ: تہذیب وثقافت کے کچھ پہلو — محمد انوار الحق تبسم — ۲۶

نثریات شبلی کی عظمت فراواں — ڈاکٹر تحسین فاطمہ — ۳۰

افسانے

حیات انسانی کا نوحہ — معین الدین عثمانی — ۳۳

ملن — غزالہ پرویز — ۳۶

کماؤ پوت — غزالہ قمر اعجاز — ۳۹

بدلتے رشتے — انور زہت — ۴۳

کاش — قیصر زاہدی — ۴۶

طنز و مزاح

احتیاط کا خبط — فضل حسنین — ۴۸

منظومات

آٹھ نظمیں — انور شمیم — ۵۰

کیا غلط ہے.....؟ / پوری نیند اور آدھے خواب — سید تحسین گیلانی / سلیم شہزاد — ۵۳

غزلیں — نصرت مہدی — ۵۴

غزلیں — سیدہ شان معراج — ۵۵

غزلیں — سید ضیاء الرحمٰن ضیا — ۵۶

غزلیں — سعید رحمانی — ۵۷

غزلیں — ڈاکٹر ذکی ہاشمی — ۵۸

غزلیں — شبانہ عشرت — ۵۹

رباعیات / دوہے — انجم بارہوی / آر۔کے۔روشن — ۶۰

کتابوں کی دنیا

منتخبات شاد عارفی — ڈاکٹر مظفر حنفی — مبصر: ڈاکٹر نسیم اختر — ۶۱

تشکیلات — کلیم اختر — مبصر: ابرار احمد اجراوی — ۶۳

دہلیز — ڈاکٹر نرگس جہاں ہاروی (ایڈوکیٹ) — مبصر: کہکشاں توحید — ۶۵

ہماری سرگرمیاں

''اکادمی آپ تک'' پروگرام کے تحت مظفر پور میں ارباب علم وادب کی قدر افزائی — ۶۷

سلام و پیام

کرشن بھاؤک، پروفیسر عبدالمنان طرزی، ڈاکٹر شائستہ انجم نوری، اختر حسین آفتاب، سلطان ساجد، شکیل سہسرامی، مشتاق جاوید، قاسم صبا، صادق علی انصاری، اختر کاظمی، ڈاکٹر سید اشرف اسمٰعیل، اسلام احمد شاہی، گل آفرین — ۶۹


**بچوں کا زبان وادب**


۷۳ — ۸۰

PDF Compressor Free Version

اداریہ

# حرف آغاز

ہماری آزادی کو آج ۶۹ سال ہوگئے اور اس ایک دن کو پانے کے لئے ہزاروں جانیں قربان ہوئیں، ماؤں کی گود سونی ہوئی، سہاگنوں کی مانگ کا سیندور اجڑا اور بہنوں کے ہاتھ میں راکھیاں جھولتی رہ گئیں، جن کلائیوں پہ اسے باندھا جانا تھا وہ آزادی کی بھینٹ چڑھ چکی تھیں، پندرہ اگست کا دن، ایک دن کی لڑائی کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ یہ برسوں پر محیط ہے۔ اگر ۱۸۵۷ء کو ذہن میں رکھیں تو اندازہ ہوگا کہ اس کے نوے سال بعد ہمیں یہ دن نصیب ہوا۔ جنگ آزادی میں مختلف مذاہب کے لوگ شامل رہے۔ کثرت میں وحدت کا ثبوت دیتے ہوئے بلا امتیاز مذہب وملت، یہاں کے رہنے والوں نے اپنا تن من دھن سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔

اس لڑائی میں اس زمانے کے علما کا کردار بھی بہت روشن رہا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ انگریزوں نے سینکڑوں علما کو پھانسی پر لٹکا دیا اور بہت سے لوگ کالے پانی کی سزا پا کر انڈمان نکوبار بھیج دئے گئے، جہاں ان کی قبریں موجود ہیں۔ اس سلسلے میں ہم علمائے صادقپور کی قربانیوں پر جتنا بھی فخر کریں کم ہے۔

یہ ایک لمبی داستان ہے جسے یہاں چھیڑنا مناسب نہیں لگتا، لیکن یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ان معاملوں میں بہار سرفہرست رہا ہے۔ ہمارا سیکولرزم آج جس زمین پہ کھڑا ہے اس کی بنیاد اسی بہار کے ویشالی میں سب سے پہلے رکھی گئی تھی۔ یہ ہمارے لئے فخر کرنے کا مقام ہے۔

اس جنگ آزادی میں جس طرح مسلم نوجوانوں، بوڑھوں اور بچوں نے حصہ لیا۔ اسی طرح ہماری زبان اردو بھی اس جدوجہد میں برابر کی شریک رہی۔ ''انقلاب زندہ باد'' کا نعرہ لوگوں میں جوش بھر دیتا تھا۔ یہ نعرہ صرف مسلمانوں کا نہیں تھا بلکہ ہندوستان کی پوری قوم اس نعرے کو الاپ رہی تھی۔ اسی طرح اردو اخباروں نے بھی اپنا بہت بڑا مثبت رول ادا کیا جس کے لئے مدیروں کو جیل کی ہوا بھی کھانی پڑی۔ یہ سب صرف اس لئے تھا کہ آزادی کی لگن ہر دل میں موجزن تھی، کہیں کوئی داؤ پیچ نہیں تھا، ایک کو چوٹ لگتی تو دوسرا اس کا درد محسوس کرتا تھا۔ ہندو مسلم، سکھ، عیسائی کی کوئی قید نہیں تھی، سب کے سب آزادی کے متوالے تھے۔ آپسی میل محبت اور بھائی چارگی کو برقرار رکھتے ہوئے اس دن کو پانا چاہتے تھے۔

بہت ساری قربانیوں کے بعد ہمیں آزادی تو نصیب ہوگئی، لیکن کیا واقعی ہم آج بھی اتنے ہی آزاد ہیں جتنا ۱۹۴۷ء میں تھے؟ کیا وہ بھائی چارگی کا ماحول ہمارے ملک میں آج بھی برقرار ہے؟ اتنے برسوں میں آخر کیا ہوا کہ ہم اپنے بھائی کو ہی آج شک کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔

ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ کسی علاقے سے سادھو سنتوں کی ٹولی گزرتی تو ہر طبقہ عزت واحترام سے پیش آتا تھا۔ اسی طرح پیر اور فقیروں کا گزر جس علاقے سے ہوتا وہ بابرکت سمجھا جاتا اور لوگ جوق در جوق ان کی طرف کھنچے چلے آتے تھے، لیکن آج اگر سادھو سنتوں کی کوئی ٹولی گیروا کپڑا پہنے کسی محلے سے گزرنے لگے تو ہر طرف لوگ شک وشبہ میں مبتلا ہوجاتے ہیں اور ایک عجیب دہشت کا ماحول پیدا ہوجاتا ہے، اسی طرح جب داڑھی ٹوپی والوں کی جماعت کسی محلے میں داخل ہوتی ہے تو ہر نگاہ مشکوک ہوجاتی ہے اور ہر زبان سے چہ میگوئیاں شروع ہوجاتی ہیں۔

آخر اتنے سالوں میں ایسا کیا ہوگیا کہ ہم نے ایک دوسرے پر اعتماد کھو دیا۔ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ملک وہی، ہم وہی، ماحول وہی تو پھر

PDF Compressor Free Version



اتنی ساری تبدیلی کیوں کر پیدا ہوگئی کہ ہم اپنے ہی بھائیوں کے لئے شک وشبہ میں مبتلا ہو گئے۔ ایسے موقع پر علامہ اقبال یاد آتے ہیں، جنہوں نے کہا تھا۔

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

ہم نے شاید اس شعر کو بالکل بھلا دیا ہے، اسی لئے نہ شکتی رہی، نہ شانتی رہی، نہ بھگت رہے تو پھر ہم پریت کے بارے میں کیا گفتگو کریں۔ دراصل آج بھی ہمیں اسی شانتی کے گیت کی ضرورت ہے جس سے ہمیں شکتی بھی ملتی ہے اور ہمارا ملک بھی محبت کے نغمے الاپتے ہوئے مکتی چاہتا ہے۔ ہم نے ان سالوں میں کیا کھویا، کیا پایا، اس کا محاسبہ بھی ضروری ہے، ہم سے کہاں کہاں اور کیسی کیسی چوک ہوئی، اس پر بھی توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے۔

آپسی لڑائی جھگڑے، دنگے فساد، مار پیٹ سے کسی کا بھی بھلا نہیں ہوتا، لیکن اگر ہم اپنی زبان کو شیریں لہجہ عطا کر دیں تو پھر زمانہ ہمارے سامنے سرنگوں ہونے کے لئے تیار ملے گا۔

اس سلسلے میں قلم کاروں کی ذمہ داری بھی بہت بڑھ جاتی ہے کہ ان کی تخلیق سے ایک تحریک ملتی ہے، عزم وحوصلہ بھی ملتا ہے اور زندگی کرنے کا سلیقہ بھی۔ قلم کاروں کو اپنی تحریروں سے اب وہ فضا بدلنی ہوگی جسے آج کے پرنٹ میڈیا اور الکٹرونک میڈیا نے زہر آلود بنا دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آج کا میڈیا دولت مند گھرانوں کا زر خرید ہو کر رہ گیا ہے۔ اسے جو اشارہ ملتا ہے وہی الاپنا شروع کر دیتا ہے۔ میڈیا کو خریدا جا سکتا ہے، لیکن ایک قلم کار کے قلم کو خریدنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ انہیں قلم کاروں نے تحریک آزادی کو بھی ایک جوش وولولہ عطا کیا تھا۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ لوگوں کے من سے میل ہٹایا جائے، دلوں میں محبت کی کاشت کی جائے اور ایک ایسی فضا قائم کی جائے جس میں سارا ملک آپسی بھائی چارگی، خلوص ومروت اور یکجہتی کی مثال بن جائے۔

PDF Compressor Free Version



ابوالکلام قاسمی

Deptt. of Urdu, AMU, Aligarh 202001 (U.P.)

# سردار جعفری کی تنقید: نظری اور عملی موقف کی کش مکش

علی سردار جعفری اپنی شعری اور تنقیدی کارکردگی کے اعتبار سے اپنے معاصرین میں ترقی پسند فکر کی نمائندہ ترین علامت بن چکے تھے۔ ترقی پسند تحریک کے آغاز کا دوران کی ادبی زندگی کا ابتدائی زمانہ تھا، جس سے انھوں نے عرصۂ دراز تک نہایت ولولہ انگیز اور جذباتی رشتہ استوار رکھا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اس وقت تک فکری طور پر اتنے پختہ کار نہ رہے ہوں کہ ترقی پسند فکر کے تمام مضمرات اور افراط وتفریط کے ساتھ اپنے معاشرے پر اس کے ممکنہ اثرات کا پوری طرح ادراک حاصل کرسکیں، مگر چوں کہ امتداد وقت کے ساتھ ترقی پسند فکر سے ان کے روابط اور ذہنی ہم آہنگی میں کوئی نمایاں فرق نہ آیا، اس لیے یہ کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ انھوں نے ساری زندگی اس ادبی فکر پر اپنا ایمان برقرار رکھا۔

سردار جعفری کو یوں تو ایک ممتاز ترقی پسند شاعر کے طور پر زیادہ جانا جاتا ہے، مگر ان کا سب سے بڑا امتیاز ان کی تنقیدی فکر ہے، اس لیے کہ وہ شروع سے اخیر تک اس سے متعلق فکری مباحث کے صرف تماشائی نہیں رہے بلکہ اپنے معاصر ہم فکر شاعروں کی فکری پشت پناہی بھی کرتے رہے اور اپنے نظریات کو ترقی پسندی سے ہم آہنگ رکھتے ہوئے ان میں جزوی تحریف بھی کرتے رہے۔ اسے ہم ان کی تنقیدی فکر کے ارتقا کا نام بھی دے سکتے ہیں، حالاں کہ ان کے بعض معاصر ہم مشرب نقادوں نے اسے مفاہمت اور سمجھوتے کا نام بھی دیا ہے۔

سردار جعفری نے تین سطحوں پر ترقی پسند تحریک سے اپنی وابستگی سرگرمی کے ساتھ جاری رکھی۔ اپنی تنقید کے ذریعے، اپنی شاعری میں ترقی پسند فکر کی موضوعاتی اور اسلوبیاتی تقلید کے ذریعے اور پھر تنظیمی طور پر اس تحریک کے کارکن کی حیثیت سے۔ اس جگہ اس امر واقعہ کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ سردار جعفری نے شروع سے ہی خود کو نقاد کہنے یا کہلانے سے گریز کیا۔ انھوں نے اپنی پہلی مبسوط تنقیدی تحریر ''ترقی پسند ادب'' میں یہ بات واضح کرنے کی کوشش بھی کی کہ:

> ''حقیقتاً میں نے نقاد کے فرائض انجام نہیں دیے ہیں، کیوں کہ مجھے نقاد ہونے کا دعویٰ نہیں ہے۔ میں نے خود ایک ادیب اور شاعر کی حیثیت سے اس تحریک کے بارے میں جو کچھ محسوس کیا ہے، جو مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے اور جس سے میرا شروع سے قریبی تعلق رہا ہے، اسے کاغذ پر منتقل کردیا ہے۔''

اسی طرح بعد کے زمانے میں اپنی کتاب ''پیغمبرانِ سخن'' کے دیباچے میں انہوں نے اس بات کا اعادہ کیا کہ:

> ''میں اپنے آپ کو نقادوں کی صف میں شمار نہیں کرتا اور میں نے پیشہ ور نقادوں کا سا رویہ بھی اختیار نہیں کیا ہے۔ میرے لیے کبیر، میرؔ اور غالبؔ کی شاعرانہ دنیا کی بازیافت خود میری شعر گوئی کے لیے ضروری ہے۔''

ترقی پسند فکر کے تنقیدی اظہار کے معاملے میں نقادوں اور نظریہ سازوں کے دو گروہ بہت نمایاں رہے۔ ایک گروہ وہ تھا جو مارکسی جمالیات کی تشکیل کے معاملے میں ادبی وشعری قدر کو نظر انداز کرنے پر کبھی آمادہ نہیں ہوا اور شعر وادب کی لازمانیت پر ہمیشہ اصرار کرتا رہا۔ اس گروہ میں سجاد ظہیر، مجنوں گورکھ پوری، اختر انصاری اور بعد کے زمانے میں ڈاکٹر محمد حسن شامل تھے۔ دوسرا گروہ وہ تھا جو ادب میں زبان وبیان اور شعری اظہار تک کو محض اپنے نقطۂ نظر کے اظہار کا آلۂ کار تصور کرتا اور فکری وابستگی کو ادبی وشعری قدر سے بالاتر سمجھتا رہا۔ اس گروہ میں اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر عبدالعلیم اور ڈاکٹر احتشام حسین کے ساتھ علی سردار

PDF Compressor Free Version



جعفری بھی ہمیشہ نمایاں رہے۔

یوں تو سردار جعفری کی تنقیدی فکر کو مربوط اور منظم انداز میں سامنے آنے کا موقع ان کی کتاب ''ترقی پسند ادب'' کے وسیلے سے ملا، مگر ان کے بنیادی موقف میں بعض ضمنی اور جزوی تبدیلیاں بھی بعد کے زمانے میں رونما ہوتی رہیں، تاہم انھوں نے اپنی تنقیدی تحریروں میں ترقی پسند نقطہ نظر سے اپنے ماضی اور حال کے ادب کے تعین قدر پر خاص توجہ مبذول رکھی، مگر اس کے ساتھ ہی اپنے شاعرانہ موقف کو بھی واضح کرنے میں کبھی تکلف سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے اپنے بیش تر شعری مجموعوں میں پیش لفظ لکھ کر اپنی شاعری کا دفاع بھی کیا اور اپنے تخلیقی عمل کی بازیافت کی کوشش بھی کی۔ انہوں نے اپنے پسندیدہ موضوعات اور طرز اظہار کا جواز بڑے مدلل انداز میں فراہم کرنے میں کبھی تکلف سے کام نہ لیا۔ حالاں کہ خلیل الرحمٰن اعظمی اور ڈاکٹر محمد حسن نے ان کی تمام تنقیدی تحریروں کو اپنی شاعری کے دفاع کی کوشش کا نام دیا ہے، اس لئے جب سردار جعفری جیسے کسی شاعر نقاد کا معاملہ درپیش ہو تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ان کی ان بعض تحریروں کو ایک نظر دیکھ لیا جائے جو انھوں نے اپنے شعری مجموعوں کے پیش لفظ کے طور پر لکھی ہیں، تاکہ ترقی پسند جمالیات کی نظری اور عملی تشکیل کا مشاہدہ زیادہ بہتر طور پر ان کی شاعری اور تنقید، دونوں کے آئینے میں کیا جاسکے۔ سردار جعفری کی ایک طویل نظم ''امن کا ستارہ'' سے معنون ہے۔ اس نظم کی تمہید اور تعارف کے طور پر سردار جعفری نے جس طرح اپنے موقف کا اظہار کیا ہے اس کی ایک جھلک کچھ یوں ہے:

> ''زبان میرے لیے مقصود بالذات نہیں ہے۔ وہ ایک سماجی وسیلہ ہے، جس کے ذریعے ایک انسان کے خیالات اور جذبات دوسرے انسان تک پہنچتے ہیں۔ اس لیے وہ خیالات و جذبات اور سماجی ضروریات کی پابند ہے۔ میری شاعری خواص کے لیے نہیں، عوام کے لیے ہے اور میری خواہش اور کوشش ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس کو سمجھ سکیں۔''

اس چھوٹے سے اقتباس میں تین نکات نمایاں ہیں: (۱) زبان، مقصود بالذات نہیں (۲) میری شاعری خواص کے لیے نہیں، عوام کے لیے ہے اور (۳) میری خواہش ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس کو سمجھ سکیں۔ جہاں تک زبان کے مقصود بالذات ہونے کی بات ہے تو شاید بڑے سے بڑا ہیئت پرست شاعر بھی زبان کو مقصود بالذات قرار نہیں دیتا اور اس کے سماجی وسیلہ ہونے سے انکار نہیں کرتا۔ اس سلسلے میں یہ بحث البتہ ضرور اُٹھائی جاتی رہی ہے کہ زبان اور فکر کے مابین کس چیز کو تقدم یا زیادہ اہمیت حاصل ہے، یا پھر یہ بات کہ زبان وبیان اور ہیئتی نیرنگیوں کے وسیلے سے فکری اظہار کے پہلو کچھ اور روشن اور بامعنی ہو جاتے ہیں یا نہیں؟ اور یہ بھی کہ اگر سردار جعفری اپنی شاعری کا مخاطب خواص کے بجائے عوام کو بتاتے ہیں تو آخر عوام کی تعریف کیا ہے؟ اگر زیادہ سے زیادہ لوگوں تک رسائی ہی عوامی شاعری کا پیمانہ ہے تو اس نوع کی شاعری کو پوری طرح غیر تزئینی، سپاٹ اور ہر اعتبار سے براہِ راست ہونا چاہیے۔ شاید سردار جعفری بھی اس مسئلے کی وضاحت ضروری سمجھتے ہیں، اسی باعث پیش لفظ کے اگلے حصے میں وہ آگے کچھ اس طرح رقم طراز ہیں:

> ''ایک ایسے سماج میں جس کی اکثریت کا بڑا حصہ جان بوجھ کر اَن پڑھ اور جاہل رکھا گیا ہو، اگر عوامی شاعری، بازاری محاوروں اور الفاظ سے ہی نہیں بلکہ گالیوں سے بھی کام لے تو کوئی ہرج نہیں، کیوں کہ ہم جس طبقے کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں اس کے کردار وافعال اتنے گھناؤنے ہیں کہ ہماری زبان کے مہذب الفاظ اس گھناؤنے پن کو ادا کرنے سے قاصر ہیں، اس لیے اس کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے بازاری محاوروں اور الفاظ کو یہ سماجی فریضہ انجام دینا پڑے گا۔''

اس اقتباس میں سردار جعفری کا نقطہ نظر بہت واضح ہے، مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خود سردار جعفری اپنی تحریروں میں اردو اور فارسی کے جن شعرا کو مثالی قرار دیتے رہے، ان میں سے بیش تر کی لسانی دبازت، استعارہ سازی اور بالواسطہ طرزِ اظہار، خود سردار جعفری سے زیادہ کس پر واضح ہو سکتی ہے۔ متذکرہ تصورات میں سردار جعفری ایک تخلیق کار یا ادب کے آزاد اور باذوق قاری کی حیثیت سے سامنے نہیں آتے بلکہ وہ

PDF Compressor Free Version



ایک مخصوص تنظیم کے مبلغ نظر آتے ہیں۔ ان کی زیر بحث نظم ''امن کا ستارہ'' میں زبان تو ان کے نقطہ نظر سے براہِ راست استعمال ہوئی ہے، مگر اشرافیہ طبقے کی اس شائستہ زبان میں عوامی شاعری، بازاری محاورات اور الفاظ کا نام ونشان تک نہیں ملتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی افتادِ طبع، اپنی تربیت اور اپنے مخصوص طرزِ اظہار کی نفی کر رہے ہیں۔ تاہم اس نظم کی زبان کو غیر مرصع زبان مان بھی لیا جائے تب بھی یہ سوال باقی رہتا ہے کہ اس کا شائبہ تک ان کی دوسری نظموں یا غزلوں میں کیوں نہیں ملتا۔ اس طرح کے خیالات جس نوع کی خود تردیدی اور خود اپنے شعری طریق کی تنسیخ کا ثبوت فراہم کرتے ہیں وہ ان کے کسی قاری سے مخفی نہیں۔

جہاں تک عوامی شاعری کے مثالی تصور کی بات ہے تو یہ معاملہ اس قدر نزاعی اور اضافی ہے کہ استعاراتی اور تہہ دار شاعری کے مقابلے میں نسبتاً کم تہہ دار اور کم معنویت کی حامل اور پھر اس کے بعد بالکل اکہری اور سپاٹ شاعری کو زیادہ عوامی شاعری قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس تنقیدی معیار کو اگر سردار جعفری، میر تقی میرؔ، مرزا غالبؔ یا اقبالؔ اور میر انیسؔ پر خود اپنی تنقید میں برتنے کی کوشش کرتے تو ان میں سے کسی بھی شاعر کی تحسین کرنے سے قاصر رہتے۔ ویسے سردار جعفری کے اس نوع کے خیالات کا نوٹس حلقہ ارباب ذوق جیسے کسی ادبی گروہ یا جدیدیت سے وابستہ ادیبوں نے کم سے کم لیا۔ بس خلیل الرحمٰن اعظمی نے اپنی کتاب ''ترقی پسند ادبی تحریک'' میں ان کے بدلتے ہوئے موقف کو ان کی ذہنی اور فکری سوانح عمری کا نام دے کر مسترد کرنے کی کوشش کی۔ اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ سردار جعفری نے اپنی مختلف تحریروں میں کبھی جذبی کبھی فیضؔ اور کبھی مخدوم محی الدین کی شاعری میں موجود ہلکے پھلکے استعاراتی لب ولہجہ پر بھی جو اعتراضات کیے تھے، ان کا خیر مقدم کبھی ترقی پسند حلقے کی طرف سے بھی نہیں کیا گیا۔ ڈاکٹر محمد حسن نے ان کے اس نوع کے تنقیدی رویے پر بہت تفصیل سے لکھا ہے اور ان کی سخت نکتہ چینی کی ہے۔ دو مختصر سے اقتباسات یہاں بھی ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں:

> ''سردار جعفری کا سارا زور اس پر تھا کہ نظموں میں سیاسی سمت کی وضاحت ضروری ہے، یہی لہجہ انھوں نے اپنی اس دور کی نظموں میں اختیار کیا اور شکست کھائی۔ یہی ان کا اسلوب شاعری قرار پایا۔ اقبالؔ نے شاید اسی کو 'برہنہ حرف نہ گفتن کمالِ گویائی ست' کہا تھا، مگر اس وقت تک سردار، اقبالؔ کے قائل تو تھے، مقلد اور مبلغ نہ تھے۔''

اسی طرح سردار جعفری کی کتاب ''ترقی پسند ادب'' کا حوالہ دیتے ہوئے انھوں نے لکھا کہ:

> ''اسی دوران ترقی پسند ادب پر سردار کی کتاب شائع ہوئی۔ اس میں ترقی پسند ادب کا نہایت میکانکی اور بڑا ہی تنگ نظر قسم کا تصور پیش کیا گیا اور اس نظریے کے ماتحت پریم چند سے لے کر منٹو، اختر الایمان اور دوسرے ادیبوں کا محاکمہ پیش کیا گیا..... اس دور کی سبھی نظموں میں سردار جعفری نے صحافتی اور کسی قدر ادعائی لہجہ اختیار کیا ہے اور آج بھی وہ اپنی نظموں کے اسی لہجے کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ لفظوں کی افراط، تشبیہ واستعارہ کی کثرت اور پُر جوش خطابت، ان نظموں کی خصوصیت بن گئی جو پتھر کی دیوار، 'خون کی لکیر'، 'تاشقند اور پیراہن شرر' کی نیم صحافتی اور نیم مبلغانہ نظموں میں ظاہر ہوئی۔''

ڈاکٹر محمد حسن نے کم وبیش انھیں خیالات کا اظہار اپنے ایک اہم مضمون ''سردار جعفری کی وراثت'' میں کیا ہے۔ اس میں انھوں نے سردار کے تنقیدی رویوں میں موجود تضادات کی نشان دہی بھی کی ہے، اور اس سلسلے میں بار بار اقبالؔ سے ان کی والہانہ عقیدت بھی زیر بحث آئی ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ اقبالؔ سے والہانہ عقیدت کا اظہار سردار جعفری نے بہت بعد میں کرنا شروع کیا، ورنہ ان کی ابتدائی تحریروں میں ان کے بعض اعتراضات اقبالؔ کی تنقید وتنقیص کے معاملے میں بہت نمایاں تھے اور ان اعتراضات کو بعد میں متعدد دوسرے ترقی پسندوں نے بھی دہرائے۔ بعض اعتراضات کچھ یوں تھے:

> ''اقبالؔ کے یہاں ماضی پرستی جتنی بڑھتی گئی اتنی ہی ان کی زبان عوام سے دور ہوتی گئی، فارسیت بڑھتی گئی..... یہ درویشی اور قلندری، شاہینی انفرادیت پرستی، تجدید مذہب اور احیائیت اور تصوف ہمارے کام کی چیزیں نہیں ہیں،

PDF Compressor Free Version



کیوں کہ ان سے آج کے عوام کو کوئی فائدہ نہیں ہوسکتا۔''

اسی طرح سردار جعفری نے اقبال کے یہاں فاشزم کی علامتیں کچھ اس طرح تلاش کیں:

''اقبال نے اپنے شاہین کو تیمور، ابدالی، نپولین اور مسولینی کی شکل میں دیکھا تھا، اور ان کے نزدیک پوری انسانی تاریخ ایسے ہی خودی سے سرشار افراد کے اشاروں پر چلتی ہے اور فوق البشر کی تلاش میں ہے۔ یہ انفرادیت پرستی اور ہیرو پرستی خالص بورژوا تصور ہے جو اپنی آخری شکل میں فاشسٹ کا روپ دھار لیتی ہے۔''

ویسے حقیقت یہ ہے کہ سردار جعفری نے اس نوع کی تنقید، ترقی پسند تحریک سے اپنی ولولہ خیز وابستگی کے زمانے میں لکھی تھی، مگر ان کی بالغ نظری اور پختہ کاری کا عہد وہ ہے جب انھوں نے خدائے سخن کے نام سے کبیر، میر اور غالب پر کتاب لکھی یا جب ان کی اہم کتاب ''اقبال شناسی'' منظر عام پر آئی۔ علامہ اقبال پر ان کی کتاب کا آغاز ان کی ایک مختصر سی نظم سے ہوتا ہے جس میں موجود عقیدت مندی اپنے عروج پر ہے۔

ناتوانوں کو عطا کی قوت ضرب کلیم
تو نے بخشے ملت بے پر کو بال جبرئیل
رند کیا، ساقی بھی جس محفل میں پیاسا تھا وہاں
لے کے آیا دل کے پیمانے میں موج سلسبیل
زندگی دشوار تر کردی غلامی کے لیے
کھینچ دی اس طرح آزادی کی تصویر جمیل
خواب کے آغوش سے بیداریاں پیدا ہوئیں
زندگی کی راکھ سے چنگاریاں پیدا ہوئیں

بھلا کوئی سوچ بھی سکتا ہے کہ سردار جعفری، یہ اشعار اسی شاعر کی شان میں لکھ رہے ہیں جو اُن کی نظر میں بورژوا، فاشسٹ اور احیا پسند لوگوں کا ترجمان ہے۔ انہوں نے اپنی اس کتاب میں اقبال کی مشرقیت، مغرب سے ان کی آویزش اور ان کے تصورِ وقت پر اعلیٰ درجے کے غیر متعصبانہ اور معروضی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان تحریروں میں نہ تو اقبال پر مغربی فاشزم کے اثرات کا کوئی ذکر ہے، نہ اقبال کی فارسی آمیز زبان ان کو عوامی ترسیل میں کہیں رُکاوٹ بنتی نظر آتی ہے اور نہ اقبال کے عرفانِ ذات بلکہ روحانیت تک میں انھیں کوئی بات ترقی پسند فکر سے مزاحم معلوم ہوتی ہے۔ ذرا ان کے بعض جملے آپ بھی ملاحظہ کیجیے:

''اقبال کا تصورِ وقت ہماری تحریکِ آزادی کا نظریاتی حربہ ہے اور ان کے فلسفہ خودی کا ایک ایسا جزو جس کے بغیر اس کی تکمیل ممکن نہیں ہے۔ وقت کی طرف رویے میں شاعر نے غلام اور آزاد کا جو فرق واضح کیا ہے وہ خون میں نئی جرأت پیدا کرتا ہے۔''

اسی طرح اقبال کی طویل فارسی نظم ''پیامِ مشرق'' پر سردار جعفری فارسی زدگی اور مغربیت زدگی کا کوئی منفی حوالہ دینا بھی ضروری نہیں سمجھتے:

''اقبال کی 'پیامِ مشرق' ایک حیرت خیز اور نشاط انگیز تخلیق ہے، جس میں حافظ کی سحر بیانی اور گوئٹے کی فکری عظمت اور اقبال کی وجدانی کیفیت نے بال و پر حاصل کرتی ہے۔ اردو اور فارسی کی ایک ہزار برس کی عظیم شاعرانہ روایت میں حسن اور طاقت اور ترنم کا یہ امتزاج بالکل نئی چیز ہے۔''

سردار جعفری کے مختلف زمانے کی تحریروں کا موازنہ کیجیے تو ان کے مابین اختلاف یا تضاد کی عجیب و غریب صورت حال سے ہمارا سامنا ہوتا ہے۔ وہ جو کچھ اقبال کے لیے کہتے ہیں اس کو ترقی پسند شعریات کی تشکیل کے عمل سے باہر کی چیز سمجھتے ہیں۔ وہ ایک طرف تو اردو زبان میں فارسی تراکیب کی آمیزش تک کو ترسیلِ معنی میں رُکاوٹ تصور کرتے ہیں، مگر دوسری طرف جب ''پیغمبرانِ سخن'' میں میر کی زبان کی توصیف کرنے پر آتے ہیں تو فارسی روایت سے ان کے استفادے کو مستحسن قرار دیتے ہیں:

''میر اور ان کے ہم عصر شعرا ایک طرف عام بول چال کی زبان کو شعر میں ڈھال کر خوب صورت اور ادبی بنا رہے تھے اور الفاظ کے نئے نئے جوڑے بٹھا کر اظہار و بیان کے لیے وسعتیں پیدا کر رہے تھے اور دوسری طرف فارسی کی ادبی روایتوں سے استفادہ کر رہے تھے اور محاوروں کا اردو ترجمہ کر کے ہندی اور ریختہ میں کھپاتے جاتے تھے۔''

سردار جعفری نے اپنے مجموعہ کلام ''پتھر کی دیوار'' کے حرفِ اوّل میں

PDF Compressor Free Version



نہ صرف یہ کہ اپنی شاعری کو وقتی کہنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی، بلکہ ان کے خیال میں ہر شاعری وقتی اور عارضی ہوتی ہے۔ شاید ان کا خیال یہ ہے کہ جو شاعری دیرپا اور معنی آفرینی پر مبنی ہوتی ہے وہ اپنی معاصر صورت حال سے کوئی تعلق نہیں رکھتی، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ کوئی بڑی شاعری اسی وقت بڑی ہوتی ہے جب اپنے زمانے کے ساتھ ساتھ معنی کے ایسے امکانات رکھتی ہے جو بعد کے زمانے کے لیے بھی وہ کارآمد ہو اور بروقت تصور کی جاسکے۔ وقتی شاعری کی حمایت میں سردار جعفری کے الفاظ کچھ اس طرح ہیں:

> ''..... اس کے معنی یہ ہیں کہ میری شاعری وقتی ہے۔ مجھے یہ بات تسلیم کر لینے میں ذرا بھی جھجک نہیں ہے۔ ہر شاعر کی شاعری وقتی ہوتی ہے۔ ممکن ہے کوئی اسے مانے یا نہ مانے، لیکن میں اپنی جگہ یہی سمجھتا ہوں۔ اگر ہم اگلے وقتوں کا راگ الاپیں گے تو بے سُرے ہو جائیں گے۔''

مگر جب وہ ''پیغمبرانِ سخن'' کے مضامین میں زیر بحث شاعروں کبیرؔ، میرؔ اور غالبؔ کا ایک ساتھ جائزہ لیتے ہیں تو ان کے درمیان اگر وہ مشترک طور پر کسی چیز کی تلاش میں کامیاب نظر آتے ہیں تو وہ ان شاعروں کی لازمانیت ہی ہے جس کے باعث ان شاعروں کی معنویت آج کی صورت حال میں بھی نہ صرف برقرار ہے بلکہ اس کی تجدید ہوتی رہتی ہے۔ یقین نہیں آتا کہ یہ الفاظ بھی سردار جعفری کے ہی ہیں جو حد سے بڑھی ہوئی عصریت کی نفی کرتے رہے ہیں:

> ''ان مضامین میں اس مشکل سوال کا جواب مل جائے گا کہ صدیاں گزر جانے اور حالات تبدیل ہو جانے کے بعد اور زبان کے انداز بدل جانے کے بعد بھی ان بزرگ شعرا کا کلام ہمارے ذوق کی تسکین کا سامان کیوں کر بن سکتا ہے۔ عظیم ادب کی جڑیں اس کے عہد میں پیوست ہوتی ہیں، لیکن پھل پھول عہد کی حدوں کو توڑ کر نکل جاتے ہیں۔''

اس نوع کے تجزیے سے جہاں ایک طرف ادب فہمی کے معاملے میں سردار جعفری کی پختہ کاری کا پتہ چلتا ہے، وہیں اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے پہلے دور کی تنقیدی تحریروں میں شاعری کی تہہ داری، ہمہ جہت تفہیم اور اس کی ہمہ گیری سے صرف نظر کرنے کا انداز ان کے مزاج سے کہیں زیادہ ان کی تنظیمی ضرورتوں کا تابع تھا۔

سردار جعفری نے اپنی ابتدائی کتاب ''ترقی پسند ادب'' میں مارکسی تصور ادب کی شیرازہ بندی کا جو فریضہ انجام دیا تھا، وہ بالعموم کرسٹوفر کاڈول اور لوکاچ کے تصورات سے استفادے پر مبنی تھا اور جس کی منتشر شکلیں کسی حد تک اختر حسین رائے پوری اور سجاد ظہیر کی تحریروں میں تلاش کی جاسکتی تھیں، مگر جعفری کا یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں کہ وہ ادب کی ماہیت، جمالیات، افادیت سے اس کے تعلق، شعر و ادب کے عوامی سروکار، براہِ راست یا بالواسطہ اظہار اور ادیب کی وابستگی یا عدم وابستگی جیسے مرکزی اور مختلف فیہ مسائل پر لگاتار توجہ صرف کرتے رہے اور ان نکات کو بنیاد بنا کر اپنی تحریک کے لیے مربوط اور مدلل انداز میں ایک نوع کی شعریات کی فکری تشکیل کی ذمہ داری نباہتے رہے، تاہم اس صورت حال میں ان کے مرتب کردہ شعری جمالیات سے جن ادبی اور تخلیقی اقدار کی نفی ہوتی تھی، ان کے رمز شناسوں کا ہدف علامت بننا بھی ایک فطری ردِ عمل سے دوچار ہونے کے مترادف تھا۔

اس مرحلے میں جب علی سردار جعفری فکری مباحث کے رد و قبول کے ایک طویل سلسلے سے دوچار ہو کر تنقیدی طور پر خود اپنی روایت کی بازیافت کو بھی اہمیت دینے کی کوشش کرنے لگے تو انہوں نے پرانی تشبیہوں، استعاروں اور علامتوں کو از کار رفتہ قرار دینے کے بجائے ان کی نوعیت تبدیل کرنے اور انھیں اپنی عصری صورت حال کا مصداق بنانے کی طرف توجہ دینا شروع کی۔ عملی طور پر تو اس کے مظاہر اقبالؔ، میرؔ اور غالبؔ پر ان کی تنقید میں سامنے آئے، مگر انہوں نے خود اپنے شعری طریق کار اور تخلیقی عمل میں بھی اسی رویے کی بازیافت کرنے کے ساتھ اس مخصوص جمالیات کو بڑی حد تک جامعیت اور شعریت کا حامل بنانے پر بھی توجہ صرف کی۔ اس رویے کے ثبوت کے طور پر ان کی متعدد نمائندہ نظموں کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس نوع کی نمائندہ نظموں میں ان کی نمائندہ ترین نظم ''میرا سفر'' ہے جس کا محرک رومی کا یہ مصرع ہے کہ ؎

ہم چوں سبزہ بارہا روئیدہ ایم

PDF Compressor Free Version



اس نظم میں بہترین وسائل شعری کا استعمال، انوکھی امیجری کی بہتات اور استعارہ سازی کی کوشش ان کو عملی طور پر تہہ دار اسلوب اور بالواسطہ طرزِ بیان کا شاعر ثابت کرتی ہے۔ ''میرا سفر'' سے معنون نظم کے بعض مصرعے کچھ اس طرح ہیں:

پھر اک دن ایسا آئے گا
آنکھوں کے دیے بجھ جائیں گے
ہاتھوں کے کنول کمھلائیں گے
اور برگ زباں سے نطق و صدا کی ہر تتلی اُڑ جائے گی
لیکن میں یہاں پھر آؤں گا
بچوں کے دھن سے بولوں گا
چڑیوں کی زبان سے گاؤں گا
جب بیج ہنسیں گے دھرتی میں
اور کونپلیں اپنی انگلی سے
مٹی کی تہوں کو چھیڑیں گی
میں پتی پتی، کلی کلی
اپنی آنکھیں پھر کھولوں گا
میں رنگِ حنا، آہنگِ غزل
اندازِ سخن بن جاؤں گا
رخسارِ عروسِ نو کی طرح
ہر آنچل سے چھن جاؤں گا

اہم بات یہ ہے کہ رویے کی یہ تبدیلی ان کی شاعری میں محض تخلیقی طور پر نہیں ملتی، ان کے تنقیدی خیالات میں بھی نظرثانی کی کیفیت دکھائی دیتی ہے۔ ان کے مجموعے ''پتھر کی دیوار'' کے ابتدائیہ میں جب ان کی یہ جمال آشنا تحریر نظروں سے گزرتی ہے تو ایک حیرت انگیز اور مسرت خیز کیفیت کا تجربہ ہوتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سردار جعفری ادبی تنقید کے معاملے میں عرصے تک ترقی پسند تحریک کے تنظیمی تقاضوں کے دباؤ میں ضرور رہے، مگر امتدادِ وقت کے ساتھ تخلیق کا اصل جوہر ان کے ہاتھ آگیا ہے۔ پیش لفظ کچھ اس طرح ہے:

''پرانی تشبیہ اور استعارے، پرانی علامتیں ایک بڑا خزانہ ضرور ہیں، لیکن اسی خزانے پر قناعت کر لینا نادانی ہے، اس لیے میں بغیر کسی جھجک کے نئی تشبیہ اور استعارے بھی استعمال کرتا ہوں، اور نئی امیجری بھی۔ میں نے اس اصول کو مفید پایا ہے کہ تشبیہ اور استعارے اور امیجری موضوع کے ماحول سے حاصل کرنے چاہئیں۔ اس لیے آپ کو میرے یہاں ایسے مصرعے ملیں گے:

شام کی آنکھ میں بارود کے کاجل کی لکیر...... یا
پہرہ داروں کی نگاہوں سے ٹپکتا ہے لہو
رائفل کرتی ہے فولاد کے ہونٹوں سے کلام
گولیاں کرتی ہیں سیسے کی زباں سے باتیں...... یا
روٹیاں چکلوں کی قحبائیں ہیں
جن کو سرمایہ کے دلالوں نے
نفع خوروں کے جھروکوں میں سجا رکھا ہے
یا پھر یہ کہ ع چاولوں کی صورت پر مفلسی برستی ہے۔''

نئی امیجری کی تخلیق اور اس استعاراتی طرزِ اظہار تک سردار جعفری کی رسائی کے انکشافات کے بعد یہی کہا جا سکتا ہے کہ جس اعلیٰ شعری روایت کے زیرِ اثر ان کی ذہنی اور فکری نشو و نما ہوئی تھی، وہی بالآخر ترقی پسند جمالیات کی تشکیل کے سلسلے میں ان کی تنقید کا بھی جوہر ثابت ہوئی اور ان کے آخری زمانے کی شاعری کا بھی۔


## ضروری اطلاع

زبان و ادب کی خریداری کے لئے آپ زرِ سالانہ سو روپے براہِ راست اردو اکادمی کے اکاؤنٹ میں بھی ڈال سکتے ہیں، لیکن رقم بھیجنے کی جانکاری کے ساتھ ہی اپنا مکمل پتہ اور موبائل نمبر اکادمی کو ضرور بھیج دیں۔

**Bihar Urdu Academy**

Bank of India, Chauhatta, Patna 800004

SB A/c No. 440810100006014

IFSC Code- BKID0004408

PDF Compressor Free Version



پروفیسر محمد طیب صدیقی

Mohalla Sher Mohammad, Bhigo, Darbhanga

# حضرت مولانا محمد بشارت کریم گڑھولویؒ اور علمائے متوسلین

(نوٹ: خیر الکلام ماقلّ و دلّ کی بنیاد پر یہ مضمون لکھا گیا ہے)

**تمہیدی کلمات**

حضرت شیخ احمد فاروقی مجدد الف ثانی ایک جید عالم و فاضل اور بلند پایہ شیخ طریقت تھے۔ آپ کی مساعی جلیلہ کی وجہ سے شریعت اور طریقت کے باہمی اختلافات کم ہوئے اور تصوف کو احکام شریعت کے حدود میں لانے میں کامیاب ہوئے۔ آپ نے بڑے واضح الفاظ میں فرمایا:

''طریقت و حقیقت خادمانِ شریعت اند''

طریقت و حقیقت کا کام یہ ہے کہ شریعت کے احکام سے قلب کا مکمل تعلق پیدا ہو جائے۔

حضرت مجدد الف ثانی نے طریقت کا وہ سلسلہ اختیار کیا جس میں احکام شرعی کا پاس تھا اور انہوں نے طریقت کے مقابلہ میں شریعت کی اہمیت واضح کر دی۔ آپ نے عقیدہ وحدۃ الوجود کی نئی توجیہ کی اور وحدۃ الشہود کا نظریہ قائم کر کے علمائے اہل شرع اور صوفیائے کرام کے اختلافات اور غلط فہمیوں کو رفع و دفع کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ آپ کے فرزندان ارجمند نے آپ کا کام جاری رکھا اور آج بھی آپ کے سلسلے کا فیض جاری ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی کے نامور خلفا میں شیخ آدم بنوری (۱) تھے۔ آپ کی خانقاہ میں ایک ہزار سے زیادہ عالیانِ معرفت جمع رہتے تھے۔ جہاں آپ جاتے تھے ہزاروں پٹھان آپ کے ساتھ ہوتے تھے۔ ۱۶۴۲ھ میں آپ لاہور تشریف لے گئے۔ ایک کثیر جماعت آپ کے ساتھ تھی۔ مقبولیت عام کی وجہ سے شاہ جہاں نے کہلا بھیجا کہ شیخ حج کو چلے جائیں۔ شیخ پہلے ہی حج کو جانا چاہتے تھے۔ بڑی خوشی سے اس حکم کی تعمیل کی اور مدینہ منورہ میں ۲۵ دسمبر ۱۶۶۳ء میں حضرت بنوری کا وصال ہو گیا۔ لاہور اور اس کے گرد و نواح میں آپ کا فیض جاری رہا۔ ان کے خلفا کی تعداد کثیر تھی جس میں کئی افغان علاقے میں تھے۔

علمائے مشائخ سرہند نے دہلی کی علمی اور روحانی زندگی کی رونق بڑھائی۔ حضرت مرزا مظہر جان جاناں جیسے بزرگ بھی سلسلۂ نقشبندی مجددی میں داخل ہو گئے، لیکن اس سلسلہ کو نئی زندگی شاہ غلام علی سے ملی۔ سر سید احمد خاں کے والد محترم شاہ صاحب سے بیعت تھے اور اسی نسبت سے سر سید احمد خاں حضرت شاہ غلام علی کو دادا حضرت کہا کرتے تھے۔ (۲)

اسی مجددی سلسلہ کے ایک نامور بزرگ شاہ احمد سعید دہلوی تھے۔ وہ پندرہ سال کی عمر میں ہی شاہ غلام علی سے فیضیاب ہو چکے تھے۔ ان کے والد شاہ ابو سعید شاہ صاحب کے مرید اور خلیفہ تھے۔ ۱۸۵۷ء کی شورش کے دوران آپ موسیٰ زئی (نزد ڈیرہ اسماعیل خاں ضلع مغربی پنجاب موجودہ پاکستان) تشریف لے گئے جہاں آپ کے جاں نثار خلیفہ حاجی دوست محمد قندھاری مقیم تھے۔ حاجی صاحب اس زمانے میں تین اہم خانقاہوں، قندھار، موسیٰ زئی اور دہلی کے سربراہ تھے۔ آپ کے خلیفہ خواجہ محمد عثمان دامانی تھے اور ان کے جانشیں اور خلیفہ ان کے صاحبزادہ خواجہ محمد سراج تھے۔ خواجہ سراج کے خلیفہ حضرت مولانا غلام حسین صاحب کانپوری تھے اور حضرت غلام حسین سے حضرت مولانا محمد بشارت کریم گڑھولوی بیعت ہوئے جو ان کے ہم درس بھی تھے۔ بیعت کے بعد آپ اپنے شیخ و پیر و مرشد کا کس درجہ لحاظ کرتے تھے اس کا اندازہ ان مکاتیب سے ہوگا جو انہوں نے اپنے پیر و مرشد کے نام تحریر کیا تھا۔ (۳)

حضرت مولانا غلام حسین صاحب کانپوری دورانِ طالب علمی حضرت مولانا فضل رحمانی گنج مرادآبادی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

PDF Compressor Free Version



شب میں ان کے مہمان بنے، صبح میں ناشتہ کے لئے چنا بھنوا کر دیا اور کانپور کے لئے رخصت کر دیا اور علوم شرعیہ کی تکمیل کی تلقین فرمائی۔ اسی طرح مولانا غلام حسین تحصیل علوم شرعیہ کے دوران حضرت خواجہ عثمان دامانی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت خواجہ نے آپ کو سلسلہ میں داخل کر کے ذکر قلبی کی اجازت دی اور فرمایا تعلیم سے فراغت کے بعد یہاں آنا۔ گویا صاحب طریقت علمائے کرام علوم شرعیہ کی تکمیل کے بعد ہی علوم باطنیہ کی تعلیم و تربیت دیتے تھے تاکہ علوم شرعیہ کی تکمیل طریقت و سلوک کی راہ میں حائل دشواریوں میں معاون و مددگار ہو سکے اور صاحب طریقت کی زندگی عین شریعت کے مطابق منزلیں طے کرتی رہے۔

**مرشد طریقت حضرت مولانا**

**حافظ محمد بشارت کریم گڑھولی**

ولادت : کے بعد بھی ۱۸۷۷ء مطابق ۱۲۹۴ ہجری

وفات : ۱۹۳۵ء مطابق ۱۳۵۴ ہجری

مقام ولادت : موضع بازید پور گڑھول، ضلع مظفر پور موجودہ ضلع سیتامڑھی، بہار

مقام وفات : موضع بازید پور گڑھول، ضلع مظفر پور موجودہ ضلع سیتامڑھی، بہار

حفظ قرآن مجید : ۱۸۹۲ء از مدرسہ جامع العلوم چندوارہ، مظفر پور، بہار

آپ نے عربی و فارسی کی ابتدائی تعلیم حکیم مولانا علی حسن صاحب چھپروی سے دربھنگہ میں حاصل کی۔ جناب حسن جان ایڈوکیٹ پٹنہ ہائی کورٹ، پٹنہ آپ کے ہم درس تھے۔ یہ محلہ مہدولی دربھنگہ کے رہنے والے تھے۔ مولانا گڑھولی کے انتقال کے بعد شاہ نور اللہ عرف پنڈت جی مہدولی میں وکیل صاحب موصوف کے مکان کے جانب جنوب کے کمرہ میں رہنے لگے۔ تقسیم ہند کے بعد کراچی، پاکستان چلے گئے اور ۱۹۵۸ء میں ان کا کراچی میں انتقال ہو گیا۔

دربھنگہ کی ابتدائی تعلیم کے بعد حضرت گڑھولی نے مدرسہ جامع العلوم مظفر پور میں داخلہ لیا۔ ۱۸۹۲ء میں حفظ قرآن پاک کی دولت سے سرفراز ہوئے۔ دستار بندی ہوئی، خوشیاں منائی گئیں اور منقبت لکھے گئے۔ حفظ قرآن پاک سے فراغت کے بعد کانپور پہنچے اور چوک صرافہ والی مسجد میں قیام فرمایا۔ مچھلی بازار کی مسجد میں نماز تراویح میں قرآن پاک تلاوت کی۔ مولانا احمد حسن صاحب سے قربت ہوئی اور ''مدرسہ فیض عام'' کانپور سے علوم نقلیہ و عقلیہ سے فراغت حاصل کی۔

حضرت مولانا گڑھولی کے تبحر علمی کا یہ حال تھا کہ ہم عصر علما کسی مسئلہ پر استفسار کرتے تو آپ برجستہ ایسا جواب دیتے کہ جیسے ابھی ابھی اس مسئلہ میں مالہ وماعلیہ کے ساتھ تیار بیٹھے ہیں۔ مولانا سے علمی و دینی امور میں استفادہ کرنے والوں میں مولانا جمیل احمد سابق صدر مدرس مدرسہ جامع العلوم مظفر پور، مولانا عبدالرحمٰن صاحب سابق صدر مدرس مدرسہ حمیدیہ گودنا ضلع چمپارن و سابق امیر خامس امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ، پھلواری شریف، پٹنہ و مولانا عبدالشکور صاحب آہ مظفر پوری، سابق استاد مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

تعلیم سے فراغت کے بعد آپ حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے۔ اس سفر حج میں مولانا غلام حسین صاحب کانپوری اور مولانا محمد علی مونگیری بھی آپ کے ہمراہ تھے۔

مدینہ منورہ میں دو سال قیام کے بعد ہندوستان واپس آ گئے۔ مکہ مکرمہ سے واپسی کے بعد علوم باطنی کی تحصیل کے لئے سرگرداں رہے۔ بعض صوفیائے کرام اور علمائے دین نے مشورہ دیا کہ آپ اپنے ہم درس سے رجوع کیجئے، چنانچہ آپ حضرت مولانا غلام حسین صاحب کانپوری سے بیعت ہو گئے۔ مولانا غلام حسین صاحب کانپوری کو دوران طالب علمی حضرت خواجہ عثمان دامانی سے بھی ذکر قلبی کی اجازت حاصل ہو چکی تھی۔ بیعت کے لئے علوم شرعیہ کی منتظر تھی۔ دوران تحصیل علوم شرعیہ خواجہ دامانی کا انتقال ہو گیا اور اپنی حیات ہی میں اپنے صاحبزادہ خواجہ سراج الدین کو اپنا جانشیں اور خلیفہ بنا دیا تھا۔ چنانچہ مولانا غلام حسین صاحب نے خواجہ سراج سے رجوع کیا، ان سے بیعت ہوئے اور ان کے خلیفہ اور مجاز ہو گئے۔

مولانا گڑھولی بیعت کے بعد اپنی بستی بازید پور گڑھول میں مستقل قیام پذیر ہو گئے اور اپنے بچوں کے درس و تدریس میں مشغول ہو گئے اور طالبان دین کی بھی تعلیم و تربیت کرتے رہے۔ علمائے کرام کی کثیر تعداد نے مولانا گڑھولی سے فیض حاصل کیا۔ چند کا تعارف اس

PDF Compressor Free Version



مضمون میں الگ عنوان کے تحت کرایا جارہا ہے۔

حضرت مولانا گڑھول کی شادی موضع محی الدین نگر، ضلع دربھنگہ موجودہ ضلع سستی پور میں ہوئی تھی۔ آپ کی اہلیہ کے والد مکرم مولانا سید عبدالغنی صاحب کا آبائی مکان کاغذی محلہ، بہار شریف تھا اور شادی محی الدین نگر میں تھی۔ موصوف اپنی سسرال میں سکونت پذیر ہوگئے تھے۔ آپ مولانا عبدالحق فرنگی محل لکھنؤ کے شاگرد تھے اور حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی سے بیعت تھے۔

مولانا کی اہلیہ کو میکے سے درشہ میں اچھی خاصی جائداد ملی تھی اس کے بعد معاشی تنگی سے نجات مل گئی۔

آپ کے چار اولاد ذکور میں سب سے بڑے حافظ مولانا محمد ایوب مرحوم، دوسرے مولانا محمد ادریس مرحوم، تیسرے مولوی ذاکر الرحمٰن مرحوم اور سب سے چھوٹے حکیم حافظ محمد سلمان مرحوم تھے اور اولاد اناث میں اور دو لڑکیاں تھیں۔ ان میں سے ایک کی شادی ڈاکٹر محمد حمید الدین انصاری مظفر پور سے تھی۔

مولانا محمد مظہر الحق کریمی ابن مولانا محمد ادریس ندوۃ العلما لکھنؤ میں درس وتدریس کی خدمات انجام دے رہے ہیں، مولوی محمد باقی باللہ کریمی ابن مولوی ذاکر الرحمٰن اور حافظ محمد نعمان کریمی ابن حکیم حافظ محمد سلمان اس خانوادہ کے اخلاف میں ہیں۔

حضرت مولانا گڑھول حنفی المسلک تھے۔ نقشبندی مجددی سلسلے میں بیعت تھے اور اہل سنت والجماعت کے چاروں مسلکوں کے ائمہ کرام کا احترام کرتے تھے۔ فروعی وجزوی مسائل پر بحث ومباحثہ کرنے سے گریز فرماتے تھے۔ آپ کی مجلس میں ہر مکتب فکر کے علماء وصلحا کو قلبی سکون حاصل ہوتا اور مقلد وغیر مقلد کے جھمیلے سے آزاد ہوجاتے۔

حضرت مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی جو اپنے دور کے جماعت اہل حدیث کے مشہور عالم تھے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور احسان والی حدیث ''ان تعبداللہ کانك تراہ فان لم تکن تراہ فانه تراك'' کے سلسلے میں فرمایا کہ اس حدیث کو قال کے ذریعہ تو کانوں نے بہت سنا تھا، لیکن مولانا گڑھول کی تاثیر صحبت نے دل میں حال کی کیفیت پیدا کردی چنانچہ میں ان کا عقیدت مند ہوگیا۔

## متوسلین علمائے کرام

### حضرت مولانا ریاض احمد بتیاوی

استاذی حضرت مولانا ریاض احمد بتیاوی موضع سنت پور، ضلع چمپارن میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ اسلامیہ بتیا میں حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے رامپور (یوپی) تشریف لے گئے اور وہیں سے فراغت حاصل کی۔ مدرسہ عزیزیہ بہار شریف اور ''مدرسہ امدادیہ'' لہریا سرائے دربھنگہ میں تدریسی خدمات انجام دیا۔ ''مدرسہ دارالعلوم دیوبند'' میں شیخ التفسیر رہے۔

مولانا ریاض احمد بتیاوی حضرت مولانا شاہ نعمت اللہ (۴) صدیقی سے بیعت تھے۔ علوم باطنیہ کی تکمیل کے لئے حضرت مولانا محمد بشارت کریم گڑھولی کی خدمت بافیض میں حاضر ہوتے رہے۔ بعد میں تقریباً دوسال تک گڑھول میں قیام پذیر رہے اور مولانا گڑھول کے صاحبزادے مولانا حافظ محمد ایوب اور مولوی محمد ادریس صاحب ذکا گڑھولوی کی تعلیم وتربیت میں مشغول رہے۔ مولانا موصوف کا انتقال ۱۹۶۲ء میں بتیا میں ہوا اور اپنی آبائی بستی سنت پور میں مدفون ہوئے۔ موضع سنت پور بتیا شہر سے دس کیلومیٹر جنوب میں واقع ہے۔

### مولانا عبدالرحمن دربھنگوی

(سابق امیر شریعت خامس، امارت شرعیہ، بہار)

مولانا عبدالرحمٰن صاحب ۱۷، اپریل ۱۹۰۳ء کو موضع پورہ دربھنگہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ''مدرسہ حمیدیہ'' قلعہ گھاٹ دربھنگہ سے حاصل کی اور ''مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ''، پٹنہ سے فضیلت کی سند حاصل کی۔ تعلیمی فراغت کے بعد ''مدرسہ محمودیہ'' راج پور (نیپال) میں تدریسی خدمات انجام دیا۔ چند سال ''مدرسہ وارث العلوم'' چھپرہ میں درس وتدریس کے کاموں میں مشغول رہے۔ ۱۹۴۰ء تا ۱۹۹۸ء میں ''مدرسہ حمیدیہ'' گودنا ضلع سارن موجودہ ضلع چھپرہ میں صدر مدرس اور ناظم رہے۔ ۲۹، ستمبر ۱۹۹۸ء میں اس دار فانی سے رخصت ہوگئے اور ''مدرسہ حمیدیہ'' گودنا ضلع چھپرہ کے احاطہ میں دفن ہوئے۔ حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب ۱۹۲۶ء میں حضرت شاہ نعمت اللہ صدیقی سے بیعت ہوئے۔ ۱۹۲۹ء میں ان کے وصال کے بعد حضرت مولانا محمد

PDF Compressor Free Version



بشارت کریم گڑھولوی سے بیعت ہوئے اور سلوک کے اسباق منزل بہ منزل طے کرتے رہے یہاں تک کہ شیخ وقت کے درجہ تک پہونچ گئے۔ مولانا عبدالرحمٰن مولانا ریاض احمد بتیاوی کے نامور شاگردوں میں تھے اور انہیں راہ سلوک وطریقت میں بھی حضرت بتیاوی کی رہنمائی حاصل تھی۔

**مولانا محمد ادریس دملوی**

مولانا محمد ادریس کا وطن موضع دملہ ضلع دربھنگہ موجودہ ضلع مدھوبنی ہے۔ آپ کی پیدائش ۱۸۹۷ء میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ کچھ دنوں تک ''مدرسہ احمدیہ'' مدھوبنی میں زیر تعلیم رہے۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے ''دارالعلوم دیوبند'' بھیجے گئے۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن کے عزیز شاگردوں میں تھے۔ اپنی بستی دملہ میں مدرسہ قائم کیا اور اس کا نام ''محمود العلوم'' رکھا۔ انہیں اپنے بڑے بھائی حافظ محمد یٰسین صاحب کا تعاون ہمیشہ حاصل رہا۔ تاحیات اسی مدرسہ میں درس وتدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ انتقال ۱۴، اپریل ۱۹۴۴ء میں ہوا۔

مولانا محمد ادریس، حضرت مولانا محمد بشارت کریم کے خاص عقیدت مندوں میں تھے اور اکثر گڑھول شریف لے جایا کرتے تھے۔ ان کے ہمراہ ان کے شاگرد رشید مولانا عبدالحفیظ چندرسین پوری بھی ہوتے۔ مولانا محمد ادریس دملوی جید عالم اور بافیض بزرگ تھے۔ علاقے کے بہت سے علمانے آپ سے فیض حاصل کیا۔

**حافظ مولانا محمد اسحاق جالوی**

مولانا اسحاق خاں صاحب موضع پرسول، ضلع مظفر پور میں پیدا ہوئے۔ جالے ضلع دربھنگہ میں شادی ہوئی۔ اپنی آبائی بستی پرسول کو ترک کرکے سسرال موضع جالے ضلع دربھنگہ میں سکونت پذیر ہوگئے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ فارسی قواعد کی مشہور منظوم کتاب ''قصد الصیغہ'' آپ کی تصنیف ہے۔ حضرت مولانا حافظ محمد بشارت کریم گڑھولوی کے عقیدت مندوں میں شمار ہوتے ہیں۔ حضرت گڑھولوی کے وصال کے بعد انہوں نے ایک قطعہ تاریخ رقم کیا۔ ملاحظہ فرمایئے ؎

بے حواسی میں ہے دماغ اپنا
لٹ گیا ہائے تازہ باغ اپنا
جا ملے حق سے مرشد برحق
دل میں دے کر ہمارے داغ اپنا
ہے یہ تاریخ سال اے اسحاق
آج گل ہو گیا چراغ اپنا

۱۳۵۴ ہجری

مولانا اسحاق جالوی شعروسخن کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ تاریخ گوئی میں خاص مہارت تھی۔ ''مدرسہ امدادیہ'' لہریاسرائے دربھنگہ کے دارالحدیث کی تعمیر کی تاریخ آپ نے یوں کہی ع

مرحبا مرحبا کیف دارالحدیث

**مولانا عبدالحفیظ چندرسین پوری**

مولانا عبدالحفیظ موضع چندرسین پور، ضلع مدھوبنی میں ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد ''مدرسہ محمود العلوم'' دملہ میں داخلہ لیا اور مولانا محمد ادریس صاحب کی زیر سرپرستی تعلیم حاصل کی۔ دیوبند گئے اور حضرت مولانا شاہ انور شاہ کشمیری کے دورہ بخاری شریف میں شریک ہوئے۔ تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد ''مدرسہ محمود العلوم'' دملہ میں مدرس بحال ہوئے۔ مولانا عبدالحفیظ صاحب ''مدرسہ محمود العلوم'' دملہ کے بعد کھرماتھرا کے مدرسہ سے منسلک ہوگئے اور اپنے پیرومرشد حضرت مولانا محمد بشارت کریم گڑھول کی اجازت سے مدرسہ کا نام ''مدرسہ بشارت العلوم'' رکھا اور اپنے نام کے ساتھ بھی بشارتی کا اضافہ کرلیا۔ اس طرح آپ مولانا عبدالحفیظ بشارتی چندرسین پوری ہوگئے۔

**مولانا محمد سعید چندرسین پوری**

مولانا عبدالحفیظ بشارتی کے وصال کے بعد ان کے چھوٹے بھائی مولانا محمد سعید صاحب نے مدرسہ کے اہتمام کی ذمہ داری سنبھالی اور درس وتدریس کی خدمت بھی انجام دیتے رہے۔ ۴ رمئی ۱۹۷۰ء کو طویل علالت کے بعد انہوں نے وفات پائی۔

مولانا محمد سعید چندرسین پوری ایک جید عالم تھے۔ ان کے شاگردوں کی ایک کثیر تعداد ہے۔ آپ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی سے بیعت تھے۔ دارالعلوم دیوبند میں ان کے اساتذہ میں شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کے علاوہ مولانا اعزاز علی اور علامہ

PDF Compressor Free Version



ابراہیم بلیاوی وغیرہ بھی تھے۔

### مولانا قاری فخرالدین گیاوی

قاری محمد فخرالدین گیاوی ابن حضرت مولانا خیرالدین گیاوی اپنے عہد کے جید عالم اور نامور شخصیت کے مالک تھے۔ ''مدرسہ قاسمیہ اسلامیہ'' گیا میں قاری صاحب اور ان کے پدر بزرگوار مولانا خیرالدین دونوں درس وتدریس کی خدمات پر مامور تھے۔ قاری فخرالدین صاحب حضرت مولانا حافظ محمد بشارت کریم گڑھولوی کے خاص عقیدت مندوں میں تھے۔ قاری صاحب کو شعروشاعری کا بھی ذوق تھا۔ ان کا مجموعہ کلام ''نورالایمان'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ حضرت مولانا گڑھول کے وصال کے بعد قاری صاحب نے ایک طویل مرثیہ ''نوائے درد'' کے نام سے رقم کیا تھا۔ اس کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

آہ کیا میں سن رہا ہوں آج یہ کیسی خبر
اپنے دامن میں لئے ہے جو قیامت کا اثر
روٹھ کر ہم سے عدم کی آج کس نے راہ لی
تاب شنوائی میں اُف یہ الم ، یہ بے کسی
مشعل راہِ ہدایت ، یادگارِ نقشبند
خضر راہِ سالکاں ، ابر بہارِ نقشبند
عارف رمز طریقت ، بادہ خوارِ نقشبند
واقف سر حقیقت ، راز دارِ نقشبند
جس کا فیض عام وقف ہر قریب و دور تھا
سچ بتاؤں کیا تھا وہ ، اک سراپا نور تھا
لیکن اے شاہِ ہدیٰ محبوب رب ذوالجلال
آہ اب تو ہوچکا اللہ سے تیرا وصال
ہاں، مگر حسرت کے قابل ہے مرے باطن کا حال
دل میں رکھنا کچھ تو اپنے فخر عاجز کا خیال
حشر کے دن آبرو رکھنا خدا کے سامنے
پیش کر دینا مجھے خیرالوریٰ کے سامنے

### حواشی

(۱) بنور، سرہند سے بیالیس میل کے فاصلہ پر ایک بستی ہے
(۲) تفصیل کے لئے دیکھئے: آثار الصنادید مصنفہ سرسید احمد خاں
(۳) تفصیل کے لئے دیکھئے: جنتہ الانوار مؤلفہ مولانا محمد ادریس گڑھولوی
(۴) سجادہ نشیں خانقاہ اندوا عباد اللہ ضلع سارن، موجودہ ضلع گوپال گنج، نزد تھاوے ریلوے اسٹیشن

❁❁❁

## اقبالؔ کا نظریہ مقاصد آفرینی

نظریہ ادب اور نظریہ تمدن کی مانند، اقبالؔ کا نظریہ مقاصد آفرینی بھی اپنا خاص امتیاز رکھتا ہے جو افلاطون کے نظریہ اعیان نامشہود سے بالکل ہی مختلف ہے۔ افلاطون کے نزدیک دنیا کے خارجی حقائق اصلی نہیں۔ زمان ومکان اور سلسلہ اسباب وعلل سب کچھ بے حقیقت ہے کہ انسان اپنی جدوجہد سے ان کی تخلیق نہیں کرسکتا، لیکن اقبالؔ کے نزدیک افلاطون کی باتیں 'مسلک گوسفندی' کے مصداق ہیں۔ اقبالؔ کا عقیدہ یہ ہے کہ جس تہذیبی معیار یا اخلاقی اقدار میں بے مقصدیت کو اساس بنایا جائے وہ بہت جلد فنا ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کلاسیکی تہذیب بے اعتقادی اور بے عملی کا شکار ہو کر اپنی فعالیت وتاثیر کھو بیٹھی۔ مقاصد اور آرزوؤں کی لگن ہر انسانی منزل پر ضروری ہے۔ مقاصد اور آرزوؤں کا سلسلہ جہاں کہیں ختم ہو جاتا ہے، وہیں زندگی بھی ختم ہو جاتی ہے۔ فطرت اور انسان میں یہی امتیازی فرق ہے کہ فطرت انفعالی حیثیت رکھتی ہے اس کے سامنے کوئی مقصد نہیں ہوتا، لیکن اس کے برخلاف انسانی نفس کا معاملہ یہ ہے کہ وہ مقاصد آفرینی سے اپنی غیر تشفی یافتہ امیدوں کو پورا کرنے کی سبیل نکالتا ہے اور جب زندگی مقصد ومدعا کی رازداں بنتی ہے تب ہی وہ اسباب عالم میں نظم وضبط کی موجب ہو پاتی ہے۔

چون حیات از مقصدی محرم شود — ضابط اسباب این عالم شود
مدعا مضراب ساز ہمت است — مرکزی کو جاذب ہر قوت است

(اخذ واستفادہ از شعرائے نامور: ص ۴۰۰ و ص ۴۰۲)

PDF Compressor Free Version

پروفیسر قدوس جاوید

R/O. 27 Green Hills Colony, Near Govt. Sec. School, Bhatandi
Jammu 181152 (J&K) (Mob. 09419010472)

# تخلیقیت اور شاعری کا طلسم

تخلیق فن سے متعلق الہام اور تجربہ، مادہ اور روح، اسلوب اور شخصیت آرکی ٹائپ اور انفرادی صلاحیت، معاشرہ اور ثقافت وغیرہ کے حوالے سے افلاطون اور ارسطو سے لے کر کولرج اور ایلیٹ، رولاں بارتھ اور دریدا تک کی ساری بحثیں نئی فکریات سے متصادم اور آر پار ہو کر نت نئی تھیوریز کو سامنے لا رہی ہیں۔ ان تھیوریز کی بنیاد پر ادب و فن کی تخلیق کے بارے میں مختلف رائیں قائم کی جاسکتی ہیں، پھر بھی ایک بات ہے جس پر اتفاق کیا جاسکتا ہے، وہ یہ کہ:

''ادب و فن میں اظہار و اعتبار سے لے کر انفراد و امکانات تک کی ساری کرنیں جس مرکزی نقطے سے پھوٹتی ہیں، وہ مرکزی نقطہ 'تخلیقیت' (Creativity) ہے۔''

تخلیق کار کی تخلیقیت کئی اعتبار سے زمین کی تخلیقیت کی مانند ہوتی ہے کیونکہ جس طرح کسی بھی بیج کے نمو اور مختلف شکلوں میں اس کے برگ و بار کے وجود میں آنے کا انحصار اصلاً زمین کی زرخیزیت پر ہوتا ہے اسی طرح کسی بھی تخلیقی جذبہ، احساس، فکر یا تجربہ کی افزائش اور مختلف فنی و ادبی صورتوں میں ان کے منصۂ شہود پر آنے کا دار و مدار بھی فنکار کی تخلیقیت پر ہوتا ہے، اسی لیے کہا گیا ہے کہ ''تخلیقیت تخلیق کار کی شخصیت کی کلیت کا جوہر لطیف ہے۔ تخلیق کار کی شخصیت کی یہ کلیت اس کے ذہنی، فکری نفسیاتی اور جذباتی عوامل کے ساتھ ساتھ اس کے تاریخی، ثقافتی اور سماجی رویوں سے تشکیل پاتی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ فنی اظہار کے مرحلے طے کرنے میں کسی ''حاوی محرک'' کا بھی اہم اور بنیادی کردار ہوتا ہے۔ یہ ''حاوی محرک'' فنکار کے ذوق، نظریہ اور طبیعت کے حوالے سے کچھ بھی، کیسا بھی ہو سکتا ہے۔

یوں تخلیقیت ہر شخص میں ہوتی ہے۔ یہ وہبی بھی ہوتی ہے اور کسبی بھی، بنیادی اہمیت اس بات کی ہوتی ہے کہ اس تخلیقیت کی نوعیت اور معیار کیا ہے اور کوئی شخص اپنی تخلیقیت کا اطلاق اور اظہار، کہاں کس شکل میں اور کس مقصد کے لیے کرتا ہے اور چونکہ تخلیقیت ایک تحرکی عمل (Exciting Process) ہے، اس لیے تخلیقیت کے اظہار اور ترسیل، مشاہدہ اور تجربہ کا تعلق فرد (فن کار) اور معاشرہ کے حالات و کوائف، عصری اقدار اور تقاضوں اور انہیں کے زائیدہ جذبہ و احساس اور فکر و دانش کی نوعیت اور معیار سے ہوتا ہے، اسی لیے کسی بھی فرد یا فنکار کی تخلیقیت کو ایک مخصوص نہج عطا کرنے میں اس کے نسلی امتیازات، اجتماعی لاشعور، ذوق جمال، فنی و لسانی شعور، ذاتی علم و آگہی، سماجی و ثقافتی انسلاکات اور ''شئے'' کی حقیقت کو دیکھنے والی ''نظر'' جیسے عناصر خصوصی اہمیت رکھتے ہیں جو کسی بھی فرد یا فن کار کے اُس ذہنی یا طبعی منطقہ (Passage) کی تشکیل کرتے ہیں جس منطقے میں آکر فرد یا فنکار کی تخلیقیت، نظریہ یا تصور، رجحان یا رد یہ، مقصد یا عقیدہ سے ہم آہنگ ہو کر وہ شکل اختیار کرتی ہے جسے اظہار میں آنے کے بعد فرد یا فنکار کا مزاج، رنگ، انداز بیان، نقطہ نظر یا جمالیات کہتے ہیں۔

تخلیقیت کے نمو، ارتقا اور اظہار میں مذکورہ بالا داخلی اور خارجی عناصر کی کارکردگی کی بنا پر مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ کسی بھی فرد یا فنکار میں تخلیقیت کے جوہر تو ہوتے ہیں، لیکن یہ جوہر وجدان اور تعقل کے ساتھ متوازن و معیاری اتحاد و اتصال اور تہذیب و تنظیم کے بعد ہی پروان چڑھتے ہیں، اس لیے تخلیقیت کا اظہار انسان کے تمام ارتقائی امکانات کا احاطہ کرتا ہے۔ خواہ وہ امکانات Spatial ہوں یا ریاضیاتی، منطقی ہوں یا نسلی۔

اب اگر خالصتاً شعر و ادب کے حوالے سے دیکھیں تو معلوم

PDF Compressor Free Version



ہوگا کہ جب کسی بھی شاعر یا ادیب کے تخلیقی جوہر، اظہاری میڈیم (زبان) کی تسخیر کے بعد فنی و جمالیاتی دروبست کے ساتھ کسی مخصوص صنف یا سانچے میں ڈھل جاتے ہیں تو اس ہیئت یا سانچے کو ادبی تخلیق کہتے ہیں۔ دیگر فنون کی طرح شعروادب میں بھی تخلیقیت کا مرکز، تصور اور تخیل ہوتا ہے۔ کسی بھی تجربہ یا مشاہدہ سے وابستگی کے نتیجے میں تخیل (Imagination) ہی تخلیقیت کو متحرک کرتا ہے، اسی لیے اکثر و بیشتر دانشوروں نے تخلیقیت کو تصور و تخیل کا ہی نعم البدل مانا ہے (گرچہ وسیع معنوں میں یہ دونوں الگ الگ عناصر ہیں) اور شعروادب میں تصور اور تخلیقیت کی مشترکہ عمل آوری کو بھی فن کار کے فنی و فکری، تخلیقی و شعری وجود کی بنیاد مانا جاتا ہے۔

تخیل یا تصور اور تخلیقیت، یوں بھی انسان کو قدرت کی عطا کردہ دو ایسی نعمتیں ہیں جن کی بنا پر نہ صرف یہ کہ تہذیب و ثقافت کا ارتقا ہوا، فنون لطیفہ میں حسن و جمال کے متنوع مظاہر اور مغائر وجود میں آئے بلکہ تخیل اور تخلیقیت کی وجہ سے ہی انسانی معاشروں میں ہر طرح کی علمی، تکنیکی سائنسی اور ادبی ترقی کے امکانات وسیع تر ہو رہے ہیں، لیکن ''تخیل و تصور'' کی مختلف النوع تشریحات و توضیحات کے حوالے سے یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ:

''تصور (تخیل) ہی ہر قماش کی تخلیقیت کے پس پشت کام کرنے والا بنیادی عنصر ہے۔''

کیونکہ عام طور پر (ہر شخص اس سچائی کا اعتراف کرتا ہے کہ) انسان پہلے تخیل و تصور میں ہی کسی بھی خواہش یا مقصد کے تار و پود بنتا ہے اور یہی تصور کرتا ہے اور ظہور میں آتا ہے، اس اعتبار سے تصور ہی ذات اور کائنات، زندگی اور زمانہ کو دیکھنے اور دکھانے کا ہمارا اولین حربہ ہے اور تصور و تخیل کی ہی مدد سے ہم کسی شے کی، ماہیت، حقیقت، سبب و جود اور امکان و عواقب کے بارے میں کوئی رائے قائم کرتے ہیں اور اُسے نام دیتے ہیں۔ چنانچہ بعض دانشوروں نے تصور و تخیل اور تخلیق کو ایک ہی معنی میں استعمال کرتے ہوئے تخیل کو نہ صرف شاعری میں تخلیق بلکہ تنقید کا بھی بنیادی محرک، منبع اور مخرج قرار دیا ہے۔ مثلاً بودلیئر نے شاعری میں تخیل کی کارکردگی کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے شاعری کی تنقید کے حوالے سے کہا ہے کہ:

''تخیل ہی وہ قوت ہے جو اشیا کے مابین گہرے قلبی اور خفیہ رشتے میں متوازیت اور مشابہت تلاش کر کے ان میں باہمی تعلق قائم کرتی ہے۔''

تخیل کی حمایت میں بودلیئر نے یہاں تک کہا ہے کہ:

''عالم اسکالر یا نقاد جو تخیل سے عاری ہے، ہمارے سامنے جھوٹے عالم یا کم سے کم نامکمل عالم کی صورت میں آتا ہے، لہٰذا وہ شخص جو تخیل کی قوت سے عاری ہے یعنی جس میں شاعرانہ صفات نہیں ہیں، جھوٹا عالم نہیں تو نامکمل ضرور ہے اور شعر کے بارے میں اظہار خیال کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔''

اسی بات کو دوسرے پہلو سے اس طرح بھی کہا جا سکتا ہے کہ جو شاعر قوت تخیل (جو اصلاً بنیادی شاعرانہ صفت ہے) سے عاری ہو وہ جھوٹا یا نامکمل شاعر یعنی متشاعر ہے، لہٰذا ظاہر ہے کہ تصور و تخیل ہی تخلیقیت میں تحرک پیدا کر کے شاعر کو تخلیق شعر پر اور قاری کو تفہیم شعر پر آمادہ کرتا ہے۔

افلاطون اور ارسطو نے تخلیق شعر کے حوالے سے پراسرار قوتوں کی جو باتیں کہی ہیں ان کی نئی تعبیرات بھی تخلیقیت کے مختلف اسرار کھولتی ہیں۔ اسی طرح غالبؔ نے اپنی شاعری میں ''غیب'' سے مضامین آنے کی جو بات کہی ہے اس کا وجدان اور الہام سے کیا رشتہ ہے یہ ایک بڑی بحث ہے، لیکن مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس سے مراد ایک اعتبار سے اظہار و بیان میں تصور و تخیل اور پھر تخلیقیت کا عمل دخل ہی ہے۔ غالبؔ کے یہاں غیب کا اشارہ تخلیقیت کے نادیدہ، اسراری اور اجنبی سرچشموں پر دلالت کرتا ہے، لہٰذا اب خالصتاً شعروادب کے حوالے سے تخلیقیت کی ایک تعریف یہ کی جا سکتی ہے کہ:

''تخلیقیت سے مراد، شاعر یا ادیب کی وہ منفرد قوت یا صفت ہے جو اس کے تصور و تخیل، ذوق و جدان زبان دانی اور اظہار و بیان کی صلاحیت وغیرہ کی آمیزش و آویزش سے

PDF Compressor Free Version



نمو پذیر ہوتی ہے اور جس کی تہذیب و تنظیم کر کے شاعر یا ادیب کسی بھی خالص اور فطری جذبہ یا احساس فکر یا تجربہ کو پرواز امکان صورتوں میں لسانی فنی اور جمالیاتی تقاضوں کے ساتھ معرض وجود میں لاتا ہے۔"

تخلیقیت کے فروغ پانے، کسی مخصوص ساخت میں ڈھلنے یا پھر تخلیقیت کے سوتوں کے خشک یا آہستہ رو ہونے کا انحصار زبان، زندگی، زمانہ اور ثقافت کے تغیر و تبدل اور نشیب و فراز پر بھی ہوتا ہے۔ تخلیقیت زندگی میں، شعر و ادب میں، فعال اور متحرک رہے، پروان چڑھتی رہے اور اظہار کے مرحلوں سے گزرتی رہے اس کے لیے ضروری ہے کہ تخلیقیت کی مستقل آبیاری اور تہذیب و تنظیم بھی ہوتی رہے۔ زندگی اور زمانہ، زبان اور ثقافت کے ساتھ گہری وابستگی مقصد اور منزل کے حوالہ سے نظریہ کی تشکیل اور لسانی فنی اور شعری اقدار و روایات اور اجتہادات و تغیرات کی معتبر واقفیت تحدید و توسیع اور تراش خراش وغیرہ تخلیقیت کی مستقل آبیاری اور تہذیب و تنظیم کے ذرائع میں شامل ہیں اسی طرح شعر و ادب کے کسی بھی شعبے میں تخلیقیت کے اظہار کے مرحلوں سے مردانہ وار گزرنے کے لیے غیر معمولی انجذابی ذہن، اظہاری صلاحیت، زبان دانی، مطالعہ و مشق، شاعری، معاشرہ اور ثقافت کی باریکیوں کی آگاہی اور ترقی یافتہ جمالیاتی شعور کا ہونا بھی ضروری ہے اور چونکہ کسی بھی شاعر یا ادیب کی تخلیقیت کے انفراد و امتیاز کی تعیین اور قبولیت کا انحصار قاری تک اس کی تشفی بخش ترسیل اور متن کے تفاعل میں قاری کی شرکت کے امکانات پر رہتا ہے، اس لیے یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ قاری جس قماش کا ہوتا ہے اور قاری کے اندر متن سے معنی و مفہوم اور کیفیت و تاثر کے اخذ و قبول کے جتنے اور جیسے امکانات ہوتے ہیں، شاعر یا ادیب کی تخلیقیت کا اثر و نفوذ اس پر اتنا اور ویسا ہی ہوتا ہے، اسی لیے کہا جاتا ہے کہ کسی بھی شاعر یا ادیب کی تخلیقیت کے معیار، مرتبہ اور نوعیت کی تفہیم و تعیین کے لیے صرف شاعر یا ادیب کے تخلیقی رویوں کی ہی نہیں بلکہ قاری کی قماش، قرأت کی نوعیت اور قاری کے ردعمل کی نوعیت کی بھی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ قاری اگر پختہ کار یا باذوق (سہروئے) ہو تو متن کی "کہی" (Said) باتوں کے علاوہ "ان کہی" (Non-Said) باتوں تک بھی پہنچ کر شاعر یا ادیب کی تخلیقیت کے انفراد و امتیاز کے مضمرات و ممکنات کا ادراک حاصل کر سکتا ہے، کیونکہ شاعر یا ادیب اپنے متن میں، اپنی تخلیقیت کی مدد سے اپنے مضمون (فکر و خیال جذبہ و احساس تجربہ و مشاہدہ) کی تخم کاری (Dissemination) تو کرتا ہے، لیکن یہ تخم کاری اکثر شاعر کی منشا سے کم بھی ہوتی ہے اور اکثر زیادہ بھی۔ یہی نکتہ قاری کو متن سے اخذ معنی کے حوالے سے متن کے تفاعل میں شریک ہونے اور شاعر کی تخلیقیت یعنی تخلیق فن کی صلاحیتوں کے طلسم کو توڑ کر شعر اور شاعر کے انفراد و امتیاز کے گوہر نایاب حاصل کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے اس بات کا اندازہ اساتذہ کے یہاں ایک ہی بحر بلکہ ایک ہی موضوع پر لکھے گئے اشعار سے بھی بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ سوداؔ، میرؔ اور غالبؔ کے درج ذیل اشعار سامنے رکھیے۔

ہے یہ دیوانہ مرید اس زلف چھٹ کس پیر کا
سلسلہ بہتر ہے سوداؔ کے لیے زنجیر کا

(سوداؔ)

سیر کے قابل ہے دل صد پارہ اس نخچیر کا
جس کے ہر ٹکڑے میں ہو پیوست پیکاں تیر کا

(میرؔ)

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

(غالبؔ)

موضوع سے قطع نظر ان غزلوں میں مضمون آفرینی، معنوی پہلو داری، اسلوب، صنعت گری، الفاظ کی تقلیل و کفایت، حشو و زوائد اور تشبیہ و استعارہ اور علامت و پیکر کے برتاؤ کی بنا پر ان تینوں شعرا کی جو الگ الگ انفرادیتیں نظر آتی ہیں اس کی وجہ بھی ان شاعروں کی تخلیقیت کا انفراد و امتیاز ہی ہے۔

سوداؔ، میرؔ اور غالبؔ تینوں ہمارے عظیم شاعر ہیں جن کی قادر الکلامی کی قسمیں کھائی جاتی ہیں، لیکن ہر ایک نے اپنی بات اپنے ہی انداز میں کہی ہے:

"سوداؔ کے کلام میں علامتی اور استعاراتی فکر کا فقدان

PDF Compressor Free Version



ہے۔ غالبؔ کے یہاں استعاراتی اور علامتی فکر میرؔ کی بہ نسبت شدید تر ہیں۔ علاوہ بریں وہ مخصوص الفاظ بھی جو ان شعرا سے وابستہ ہیں ان غزلوں میں نظر آتے ہیں۔''

میرؔ اور غالبؔ کی تخلیقیت کے فرق کو اس زاویے سے دیکھیں تو کہہ سکتے ہیں کہ میرؔ کی تخلیقیت شکست ذات کے اظہار سے عبارت ہے اور غالبؔ کی تخلیقیت عرفان ذات کے اظہار سے۔ میرؔ کی تخلیقیت زندگی کی دردمندی کی کیفیات کا اظہار کرتی ہے جبکہ غالبؔ کی تخلیقیت زندگی سے نبرد آزمائی کے جذبات پیدا کرتی ہے۔

بعد ہمارے اس فن کا جو کوئی ماہر ہووے گا
درد انگیز انداز کی باتیں اکثر پڑھ پڑھ رووے گا

(میرؔ)

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

(غالبؔ)

اور ایک میرؔ اور غالبؔ ہی پر کیا موقوف ہر جینوین شاعر کی تخلیقیت کی اپنی ایک الگ شان ہوتی ہے۔ وہ چیز جسے کسی شاعر کا ''مزاج'' یا ''رنگ'' یا ''طرز'' کہتے ہیں، وسیع معنوں میں اس سے مراد شاعر کی منفرد تخلیقیت ہی ہے، اسی لیے ایک ہی زمین (وزن، بحر، قافیہ، ردیف) اور ایک ہی مضمون (فکر، خیال، جذبہ یا تجربہ) ہونے کے باوجود یہ ممکن نہیں ہے کہ ہر شاعر ایک ہی معیار کا شعر کہہ پائے ع

طرز بیدل میں ریختہ کہنا، اسد اللہ خاں قیامت ہے

''دراصل ہر شاعر کو، اس کے تخلیقی وجود کے اندر روشن تخلیقیت کا چراغ ہی اظہار و بیان کی کسی مخصوص و منفرد راہ پر ڈالتا ہے۔ البتہ ہم آہنگی کی بنا پر اسلاف یا اساتذہ کے رنگ اور مزاج کی تقلید، پیروی یا اثر انگیزی نہ تو ممنوع ہیں اور نہ نایاب۔ (ایک زمانے میں) بعض ناقدین نے ناصرؔ کاظمی، خلیل الرحمٰن اعظمی اور باقرؔ مہدی کے یہاں میرؔ کے رنگ یا پھر فیضؔ اور پھر ظفرؔ اقبال اور ساقیؔ فاروقی کے یہاں کسی حد تک غالبؔ کے انداز بیان کی جو باتیں کہی ہیں انہیں جھٹلایا نہیں جا سکتا کیونکہ یہ بھی ایک بڑی سچائی ہے کہ کسی بھی شاعر کی تخلیقیت کو مخصوص رنگ، مزاج کا نام قاری (نقاد) ہی دیتا ہے۔ وہی شعر (متن) کی تخلیقیت کی تہیں کھولنے والا ہوتا ہے۔ بلکہ 'ساختیات' کے رُو سے تو یہ مانا جاتا ہے کہ ''مصنف اور قاری ایک ہی عمل (تخلیقی عمل) کے دو مدارج ہیں۔ کوئی بھی متن محض مصنف یا محض قاری کے تخلیقی عمل کا نتیجہ نہیں ہے ان دونوں کی Interaction ہی سے یہ معجزہ رونما ہوتا ہے۔''

دوسرے لفظوں میں شاعر کے لسانی برتاؤ اور معنیاتی نظام کے حوالے سے کسی بھی متن میں شاعر کی ''تخلیقیت'' اکہری یا تہہ دار، وحدانی یا تکثیری، طے شدہ یا آزاد معنی و مفہوم، کیفیت و تاثر کی صورتوں میں ہوتی تو ہے، لیکن تخلیقیت کے ان تمام پہلوؤں کو قاری ہی اپنی قرأت کے ذریعے ''موجود'' بناتا ہے کیونکہ متن (شعر یا نظم) میں اپنی تخلیقیت کی بنا پر کسی بھی خیال یا فکر، تجربہ یا احساس کی تخم ریزی (Dissemination) شاعر کا اپنا معاملہ ہے اور متن میں موجود شعری تجربہ کو گرفت میں لینا قاری کا اپنا اور گرچہ بظاہر شاعر اور قاری دونوں ہی اپنے اپنے معاملات میں آزاد ہیں، پھر بھی متن (شعر، نظم) میں موجود شعری جوہر موضوع یا تجربہ، معنی و مفہوم، شاعر کی تخلیقیت کے اندرون میں نمو پزیر ہونے والی ایک ہی شعری صداقت (Poetic Reality) کے مختلف نام ہیں اور شاعر اپنے متن میں جو بھی فکر یا تجربہ پیش کرتا ہے وہ کسی ٹھوس، حتمی اور یک رُخی صورت اور حالت میں نہیں ہوتا بلکہ شاعر کی تخلیقیت (تصور و تخیل، فکر و تجربہ، لسانی آگہی، فنی مہارت اور جمالیاتی شعور وغیرہ) کے عمل دخل کے نتیجے میں وہ تجربہ ایک سے زیادہ معنیاتی (Semantical) صوتیاتی، جمالیاتی اور کیفیاتی ابعاد رکھتا ہے اور جیسا کہ دریدا سے لے کر رُولیا کرسٹیوا تک نے مانا ہے کہ یہ قاری ہی ہوتا ہے جو زبان کے دروازے سے متن شعر یا نظم کے طلسم خانے میں داخل ہوتا ہے اور شاعر کی تخلیقیت کے تمام ابعاد کی گرہیں کھولتا ہے اور ان میں باہمی ربط پیدا کر کے متن (فن پارے) کا تخلیقی اور تعبیری وجود قائم کرتا ہے۔ اس

PDF Compressor Free Version



اعتبار سے ''تخلیقیت'' اظہار سے لے کر اقرار تک کے لیے شاعر اور قاری دونوں پر انحصار رکھتی ہے۔

''تخلیقیت'' اور شاعری کے طلسم کے حوالے سے ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ تمام تر فنون لطیفہ میں اگر شاعری کو افضل ترین قرار دیا جاتا ہے تو اس وجہ سے کہ شاعری اپنے اندر ''تخلیقیت'' کے اظہار کے بے حد وحساب امکانات رکھتی ہے، کیونکہ شاعری میں شاعر اول تو اپنے تصور و تخلیل، جذبہ واحساس، وجدان وادراک، مطالعہ ومشاہدہ، فکر اور تجربہ، مقصد اور نظریہ اور روایات واجتہادات کے جملہ سرمائے کو شعوری یا لاشعوری طور پر اپنے تخلیقی وجود میں سمیٹتا ہے۔ دوئم اپنی تخلیقیت کی تہذیب وتنظیم کر کے شاعرانہ اظہار کے لیے ایک ایسی تخلیقی زبان ایجاد کرتا ہے جو اس کی شاعری کو متحرک رکھتے ہوئے اس کا فکری اور شاعرانہ انفراد قائم کرنے کی متحمل ہو سکے۔ یہ عمل شعوری سے زیادہ لاشعوری طور پر تکمیل پذیر ہوتا ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ شاعر کے جذبات واحساسات کے حوالے سے ہی موزوں ومناسب الفاظ اچھے شاعر یا فن کار کے یہاں جمع ہوتے ہیں اور شعر یا نظم کا موضوع خود سارا تخلیقی نظام ترتیب دیتا اور اکٹھا کرتا ہے۔ یہ نہیں کہ سارا نظام درست کر کے شاعر یا فن کار اپنا خیال یا موضوع منتخب کرتا ہے اور اس میں اپنے محسوسات داخل کرتا ہے۔

اب اگر ایک قدم آگے بڑھ کر یہ مان لیں کہ ''مناسب الفاظ'' از خود بھی جمع ہوتے ہیں اور جمع کیے بھی جاتے ہیں اور تراش خراش، انتخاب اور برتاؤ کے نتیجے میں یہ موزوں ومناسب الفاظ جس شعری زبان کی تشکیل کرتے ہیں وہی تخلیقی زبان کہلاتی ہے، لیکن شاعری کے حوالے سے تخلیقی زبان کی شناخت کیا ہو سکتی ہے اس کی وضاحت کرتے ہوئے شمس الرحمٰن فاروقی نے لکھا ہے:

> ''تخلیقی زبان چار چیزوں سے عبارت ہے، تشبیہ، استعارہ، پیکر اور علامت، استعارہ اور علامت سے ملتی جلتی اور بھی چیزیں ہیں مثلاً تمثیل (Allegory) آیت (Sign) نشانی (Emblem) وغیرہ، لیکن یہ تخلیقی زبان کے شرائط نہیں ہیں اوصاف ہیں۔ ان کا نہ ہونا زبان کے غیر تخلیقی ہونے کی دلیل نہیں۔ علاوہ بریں انہیں استعارے کے ذیل میں رکھا جا سکتا ہے، لیکن تشبیہ، پیکر، استعارہ اور علامت میں کم سے کم دو عناصر تخلیقی زبان میں ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ اگر دو سے کم ہوں تو زبان غیر تخلیقی ہو جائے گی۔''

لیکن یہ بھی یاد رہے کہ شمس الرحمٰن فاروقی نے تخلیقی زبان کی توضیح جدید شاعری کے اسلوبیاتی انفراد کے حوالے سے کی ہے۔ یہ توضیح مسئلے کا حل نہیں بذات خود ایک مسئلہ ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے خود ہی کہا ہے کہ:

> ''جدیدیت پسند نظم چونکہ زیادہ تر ذاتی تاثرات پر مبنی تھی، اس لیے اس نے مناسب تشبیہات، استعارات اور علامات کو تو اختیار کیا..... لیکن الگ سے مناسبت وغیرہ پر کوئی خاص توجہ نہ دی اور مناسبت کی شرط یہی ہے کہ کلام میں الفاظ یا فقرے ایسے ہوں جن کا آپس میں معنوی علاقہ ہو۔''

اور جدید شاعری میں علامتی اور استعاراتی شاعری کے حوالے سے معنوی انتشار، ناہمواری اور بے ربطی کی جو بھرمار ملتی ہے اس سے ہر شخص واقف ہے۔ ویسے مشرقی شعریات میں شاعری کی زبان کے حوالے سے اس بات پر اصرار کیا گیا ہے کہ:

> ''خیال کیسا ہی بلند اور دقیق ہو، مگر پیچیدہ اور ناہموار نہ ہو اور الفاظ جہاں تک ممکن ہو محاورہ اور روزمرہ کی بول چال کے قریب ہوں۔''

قتیبہ اور جاحظ، نظامی عروضی اور رشید الدین وطواط وغیرہ نے اعلیٰ شعر کے لیے مضمون کے ساتھ ساتھ زبان کے بھی عالی ہونے کی جو شرط عائد کی تھی اس کا تعلق بھی کئی زاویوں سے تخلیقیت سے ہی ہے اور اگر اردو میں شاعری سے متعلق حالی، شبلی، امداد امام اثر، عبدالرحمٰن، نجم الغنی، انشا اور حسرت موہانی سے لے کر گوپی چند نارنگ اور شمس الرحمٰن فاروقی تک کی بحثوں کو تخلیقیت کے حوالے سے نچوڑ کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ جو خصوصیات شاعری کو اعلیٰ بناتی ہیں وہ آج بھی کم وبیش وہی ہیں جو کل تھیں یعنی زبان کی تراش وخراش کی ندرت، الفاظ کا انتخاب اور غیر روایتی

PDF Compressor Free Version



برتاؤ، مصرعوں کی بندش، تراکیب اور قافیوں کا رکھ کھاؤ اور استعارات و علامات کی تشکیل وغیرہ میں جدت و نفاست، لطافت و ہنرمندی فکر و تجربہ کی تازہ کاری جذبہ و احساس کی گھلاوٹ، تصور و تخیل کی وسعت، اسلوب و اظہار کی معنوی گہرائی و تہہ داری اور ان سب کی مجموعی ترتیب و پیش کش میں شائستگی، توازن، ہم آہنگی اور فنی مہارت وغیرہ۔ وسیع معنوں میں یہ سب تخلیقیت کے ہی لوازمات ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ساری خصوصیات ہر شاعر میں یکساں طور پر نہیں ہوتیں، لیکن جن کے یہاں ان میں سے جتنی زیادہ خوبیاں جمع ہو جاتی ہیں وہ اتنا ہی بڑا اور منفرد شاعر کہلاتا ہے۔

ایک بات یہ بھی ہے کہ کسی مخصوص عہد میں ہمہ جہت اور دیدہ و نادیدہ سیاسی، معاشی اور معاشرتی و ثقافتی حالات و کوائف کے سبب کوئی بھی ادبی صنف مثلاً غزل، لسانی شعری اور اقداری تغیر و تبدل کی بنا پر اپنے ارتقائی مراحل میں کئی اعتبار سے اجنبیت کی حد تک نیا روپ، نئی ساخت تو اختیار کر لیتی ہے، لیکن اپنے بنیادی صنفی امتیازات، لسانی و ادبی روایات اور شعریات سے صد فی صد لاتعلق نہیں ہو جاتی، نہیں ہو سکتی۔ میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ، فیضؔ، فراقؔ اور شادؔ کی غزلیں اس کی بہترین مثالیں تو ہیں ہی آج کی تاریخ میں ناصرؔ کاظمی، شجاعؔ خاور، پروین کمار اشکؔ، عرفان صدیقی، رفیق راز، عبدالاحد سازؔ اور اسعدؔ بدایونی سے لے کر عالم خورشید، راشد انور راشدؔ، شفقؔ سوپوری، خورشید اکبر، جمال اویسی، خالد عبادیؔ، مشتاق صدف، رغبت شمیم ملک وغیرہ تک کی مابعد جدید غزلوں کی نئی ساخت میں بھی اجنبی آوازوں کے ساتھ ساتھ سابقہ غزل کی شعریات کی مانوس سرگوشیاں سنائی دیتی ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ سابقہ اور حالیہ غزل کی ساخت اور شعریات کے مابین موجود وہ جدلیاتی رشتہ ہے جو اصلاً زبان کے تخلیقی برتاؤ کی بنا پر ہی قائم ہوتا ہے۔ حالی کے بقول:

"زمانہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر جائے اس کو قدیم نمونوں سے کبھی استغنا حاصل نہیں ہو سکتا۔"

اور رولاں بارت بھی یہ مانتا ہے کہ:

"ہر نیا متن، ماقبل کے کارناموں کی زبان، آہنگ اور اصولوں (شعریات) کا ہی حصہ یا سایہ ہوتا ہے جو نئے متن میں نئے انداز میں نمایاں ہوتا ہے۔"

دوسری بات یہ کہ کسی بھی زندہ اور فعال زبان (مثلاً اُردو زبان) کی شاعری (ادب) عالمی ادبی، لسانی، فنی اور جمالیاتی، رجحانات اور نظریات کے اثرات قبول تو کرتی ہے، لیکن ساتھ ہی مقامی، معاشرتی، سیاسی اور ثقافتی نشیب و فراز کو بھی اپنے اندر سمیٹتی ہے، انھیں جیتی ہے اور اپنے صنفی امتیازات اور تقاضوں کے مطابق شاعر کو محسوس یا نامحسوس طور پر اپنی شاعری میں تازہ کار فکری و تخلیقی رویوں اور ہیئتوں کو برتنے پر آمادہ کرتی ہے اور اس طرح شاعری جس نئے داخلی اور خارجی انداز میں سامنے آتی ہے وہی شاعری (شعر و نظم) کی نئی ساخت ہوتی ہے۔ اس نئی ساخت میں ہی معنی و مفہوم، کیفیت و تاثر کا طلسم خانہ ہوتا ہے، جس کی تہوں اور طرفوں کو باذوق قاری اپنی تخلیقی قرأت کے ذریعے کھولتا ہے۔

غزل کے حوالے سے ہی آج کی شاعری کے طلسم یا ساخت کی باتیں کریں تو کہنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی کہ آج کی غزل کی ساخت، سابقہ غزل کی ساخت سے اپنی الگ پہچان بھی رکھتی ہے۔ عبدالاحد سازؔ اور عالم خورشید کی غزل کی ساخت، شہریارؔ اور مظہر امام کی غزل کی ساخت سے مختلف ہے، بالکل اسی طرح جس طرح مظہر امام اور شہریارؔ کی غزل فیضؔ اور فراقؔ کی غزل سے جداگانہ ساخت رکھتی ہے، لیکن نہیں بھولنا چاہئے کہ غزل کی ہر نئی ساخت، سابقہ غزل کی ساخت سے کئی زاویوں سے کسی نہ کسی حد تک رشتہ ضرور رکھتی ہے اور شاعری کے اس طلسم کا در کھولنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ ساختیات کی رو سے "شعری ساخت" سے مراد محض کسی شعری تخلیق کی خارجی اور اکہری ساخت ہی نہیں بلکہ داخلی، تہہ دار ساخت بھی ہے۔

خارجی ساخت میں الفاظ و تراکیب کی (سادہ یا علامتی) ترتیب کے حوالے سے (عموماً) طے شدہ، اکہرا اور وحدانی لغوی معنی ہوتا ہے جب کہ تخلیق (شعر، نظم) کی داخلی ساخت غیر روایتی (غیر مانوس) الفاظ کے انتخاب اور منفرد تخلیقی برتاؤ کے سبب سیال، صد پہلو اور تکثیری معنی و مفہوم اور کیفیت کا اخراج کرتی ہے، اسی لیے کسی بھی شعر یا نظم کے طلسم کی تفہیم اور توضیح و تعبیر کے عمل میں قاری کی شرکت کے امکانات اگر وسیع ہوتے ہیں تو اس شعر یا نظم کی باطنی ساخت کی بنا پر، خارجی ساخت کی

PDF Compressor Free Version



بنا پر نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بھی تخلیق کی قدر و قیمت کا تعین کرتے ہوئے ساختیاتی اندازِ فکر کی رو سے اس تخلیق کی خارجی ساخت سے زیادہ اس کی باطنی ساخت پر توجہ دی جاتی ہے کیونکہ باطنی ساخت ہی تخلیق کی حقیقی شعری ساخت ہوتی ہے جو شاعر یا ادیب کے تخلیقی تجربہ کی آماجگاہ ہے۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ افسانہ کی قدر و قیمت کا انحصار ''افسانویت'' پر، انشائیے کا ''انشائیت'' پر، مرثیہ کا ''مرثیت'' پر اور غزل کا ''تغزل'' پر ہوتا ہے تو گویا ہم اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ کسی بھی تخلیق کے اصل تخلیقی تجربے کو اس وقت تک تشفی بخش حد تک سمجھا یا سمجھایا نہیں جا سکتا جب تک کہ اس تخلیق کی باطنی ساخت کے زیادہ سے زیادہ پہلوؤں، تہوں اور طرفوں کا ادراک نہ حاصل کر لیا جائے۔ ایسا اس لئے کہ کسی بھی تخلیق کی باطنی ساخت کے ایک نہیں کئی کئی پہلو ہوتے ہیں اور خصوصاً شاعری کے مزاج میں چونکہ رمزیت اور اشاریت کی بھی ایک بنیادی اہمیت ہوتی ہے اس لئے شعری تخلیق کی باطنی ساخت کے ہر ہر پہلو سے کئی کئی فنی و جمالیاتی پہلو نکلتے ہیں اور ایک پہلو دوسرے پہلو کو چھوتا بھی ہے، ایک دوسرے کو کاٹتا بھی ہے اور آر پار بھی ہوتا ہے، اسی لئے کسی بھی شعری تخلیق سے تخلیقی تجربے کو اس طرح نہیں نکالا جا سکتا جس طرح پھل سے رس نکالا جاتا ہے۔ سبب کیا ہے؟ سبب یہ ہے کہ شعر و ادب کی توضیح و تفہیم کے لیے ہم افسانویت، انشائیت، مرثیت اور تغزل جیسی اصطلاحات کا استعمال تو کرتے ہیں، لیکن خوب جانتے ہیں کہ ایسی کسی بھی اصطلاح کی کوئی حتمی تعریف نہ موجود ہے نہ ممکن۔ مثال کے طور پر میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ جیسے کسی بھی بڑے غزل گو شاعر کی غزلوں کے پیش نظر تغزل کی کوئی بھی تعریف دوسرے کے تغزل کی نفی ہی کرے گی۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے اس ضمن میں بڑی عمدہ وضاحت کی ہے:

> ''غزل کے بارے میں یہ آخری بات کہہ کر بحث ختم ہو سکتی ہے کہ غزل میں تغزل ہوتا ہے، یہ تعریف نہ صرف اس لئے نامناسب ہے کہ خود تغزل کی اصطلاح کچھ ایسی گول مٹول قسم کی ہے کہ اس کی حد بندی ممکن نہیں، بلکہ اس لئے بھی کہ تغزل جو کچھ بھی ہو اس کے نشانات نظم میں بھی ڈھونڈ لینا کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ غالبؔ، پھر اقبالؔ اور یگانہؔ نے غزل کے لہجے میں ایسے دور رس تغیرات داخل کر دئے ہیں کہ ان کی روشنی میں تغزل کی تعریف کسی بھی دوسرے غزل گو مثلاً میرؔ کے تغزل کو مشتبہ کر سکتی ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ غالبؔ کے یہاں بھی تغزل ہے اور میرؔ کے یہاں بھی تو یہ سوال اُٹھ سکتا ہے کہ پھر تو ہر چیز تغزل ہے۔''

اب اگر اس فقرہ ''ہر چیز تغزل ہے'' کو متن کی تفہیم و تعبیر کے عمل میں قاری کے کردار کے حوالے سے پھیلا کر دیکھیں تو پہلی بات تو یہ سامنے آئے گی کہ غزل کا کوئی شعر (متن) قرأت کے نتیجے میں قاری پر ''تخلیقی تجربہ'' کے معنی و مفہوم، کیفیت اور تاثر کے کن کن پہلوؤں کو منکشف کرے گا، کوئی نہیں کہہ سکتا۔ البتہ مخصوص ثقافت کے اندر، منفرد، ذوق، حافظہ، حوالے اور انسلاکات رکھنے والا قاری ضرور کہہ سکتا ہے کہ مخصوص لمحہ میں قرأت کے نتیجے میں شعر قاری کے وجود کے اندر معنی اور کیفیت، مسرت اور بصیرت کے جو جھماکے کرتا ہے وہی اُس لمحے میں اس شعر (غزل) کا تغزل ہے، لیکن جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ غزل اپنی ایک زندہ متحرک، سیال اور تغیر پذیر شعریات بھی رکھتی ہے، اسی لئے ہر دور میں غزل کی ساخت لسانی و شعری ہر اعتبار سے نئے التزامات اور امتیازات کے ساتھ سامنے آتی رہی ہے۔ اب اگر اس حقیقت کو بھی تسلیم کرتے چلیں کہ غزل یا اردو شاعری جدیدیت سے بہت آگے نکل کر مابعد جدید ثقافتی صورت حال کا سامنا اور اظہار تو کر رہی ہے لیکن ابھی بھی مابعد جدید شعری جمالیات کے خط و خال واضح نہ ہونے کے سبب اُردو کے اکثر و بیشتر شعرا یہ سمجھ نہیں پا رہے ہیں کہ شاعری کی تخلیق کن شعری اقدار اور تقاضوں کے مطابق کس طرح کے لسانی، ادبی اور شعری نظام کے تحت کی جا سکتی ہے۔ یوں بھی مابعد جدیدیت کی شعری جمالیات وحدانی اور یک رخی نہیں تکثیری اور صد پہلو ہے۔ البتہ مابعد جدید شعریات کا اصرار ہے کہ اب اہمیت ادبی تحریر کی ساخت اور ہیئت کی نہیں، اُس بنیادی جوہر کی ہے جو تحریر میں تخلیقی و جمالیاتی حسن پیدا کرتا ہے۔ یہی ''حسن'' اپنے تمام تر التباسات کے ساتھ فکری و نظریاتی ہی نہیں، جذباتی و حسیاتی سطح پر بھی ''قاری'' کو شاعری کے طلسم تفہیم و تعبیر کے لئے متحرک کرتا ہے۔

PDF Compressor Free Version



مابعد جدید لسانی و ادبی نظریات کے سبب یوں بھی شعر و ادب کی مختلف اصناف کے درمیان کی ہئیتی سرحدیں آج ٹھوس اور مستقل ہونے کے بجائے سیال اور تغیر پذیر ہو چکی ہیں، لہٰذا کوئی بھی ادبی تحریر آج کسی مخصوص مروجہ صنف کے ساتھ اپنا شناختی رشتہ تو ضرور قائم رکھتی ہے، لیکن یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ''ادبی تخلیق'' واقعی اس مخصوص صنف کے دائرے میں، اسی طرح صدفی صد آئے گی جس طرح تین چار دہائی قبل کی ویسی ہی کوئی ادبی تخلیق اس مخصوص صنف کے دائرے میں آتی تھی۔

اس صورتِ حال کو نت نئے لسانی و ادبی تصورات اور تھیوریز کے دفور نے اور زیادہ پیچیدہ بنا دیا ہے، اسی لئے آج تخلیقیت اور شاعری کے طلسم کو سمجھنے کے لئے متن، مصنف، معنی، معاشرہ، قاری، زبان اور زندگی وغیرہ کے حوالے سے جن نکات پر خصوصیت کے ساتھ توجہ مرکوز کی جا رہی ہے وہ ہیں، متن کی ساخت، متن کی قرات، متن کے تفاعل میں قاری کی شرکت کے امکانات، متن سے مصنف کا غیاب، متن کا دوسرے متن یا متون سے رشتہ، متن میں معاشرتی، سیاسی اور ثقافتی حوالے اور اکتسابات، معنی کی تشکیل یا ردِ تشکیل میں قاری کے حافظہ، مطالعہ اور انسکلاکات کا حصہ، متن میں معنی کی توسیع و تجدید اور تحدید و التوا، متن اور موضوعیت، زبان کا برتاؤ، متن کی معنیاتی (Semantic) نحویاتی (Syntactical) اور لفظیاتی (Verbal) جہتیں وغیرہ۔

ظاہر ہے کہ سخن فہمی اور قدر سنجی سے متعلق ان ڈھیر سارے نکات کی بنا پر قارئین ادب شناسی کے عمل کو ایک لسانی و نظریاتی کھیل، ادبی شعبدہ بازی، علمی مشقت یا پھر فلسفیانہ دیدہ ریزی ہی سمجھیں گے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ کوئی بھی قاری (نقاد) کسی تخلیق کو سمجھنے سمجھانے کے لیے مذکورہ بالا نکات میں سے چند ایک پر ہی توجہ مرکوز کر پاتا ہے کیونکہ ادبی تخلیق کے کسی بھی جائزے میں تمام نکات کو بروئے کار لانا ممکن بھی نہیں۔ چنانچہ اب اگر اس پس منظر میں آج کی شاعری کے حوالے سے شاعری کے طلسم کو سمجھنے کی کوشش کریں تو معلوم ہوگا کہ مندرجہ بالا نکات ہی شاعری کے طلسم خانے میں داخل ہونے کے دروازے ہیں، لیکن سب سے اہم اور ہمہ جہت امکانات رکھنے والا دروازہ، زبان کا دروازہ ہے، کیونکہ شاعری میں بھی زبان ہی بولتی ہے شاعر نہیں اور غزل یا غزل کے کسی شعر کے وجود میں آنے سے پہلے اور بعد غزل یا شعر کے اردگرد زبان ہی ہوتی ہے۔ گویا زبان میں ہی شاعر کی شاعری اور تخلیقیت کا سارا طلسم مضمر ہوتا ہے۔

دراصل شاعری کے طلسم کو کھولنے کے لئے ہی اگر شاعری کو چیزے دِگر، جزو پیغمبری، عطیہ خداوندی اور کرشمہ غیب وغیرہ سے تعبیر کیا جاتا ہے تو اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ شاعری، اعلیٰ اور عمدہ شاعری، تخلیقیت کے مختلف النوع عناصر، جذبہ و احساس، مشاہدہ و تجربہ، تخیل و تصور اور عرفان و ادراک کی ترتیب اور تحرک و فعالیت کے نتیجے میں ہی لسانی اور جمالیاتی اقدار کے مطابق وجود میں آتی ہے، اسی لیے ''تخلیقیت'' کی طرح ''شاعری'' کی بھی کوئی ایک حتمی اور مستقل تعریف ممکن نہیں، لہٰذا جو شخص اپنے ذوق، ذہن اور لسانی استعداد کے مطابق شاعری کے جس پہلو کو گرفت میں لے پاتا ہے اُسی کی بنیاد پر وہ شاعری کی تعبیر و توضیح پیش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشرق و مغرب میں شاعر، شاعری اور شعریات کے بارے میں جو تعبیرات پیش کی گئی ہیں وہ ایک دوسرے سے مختلف بھی ہیں اور متضاد بھی۔

ہر شخص جانتا ہے کہ شاعر کے لفظی معنی صاحب شعور کے ہیں اور شعور سے مراد جذبہ و احساس بھی ہے، تصور و تخیل بھی اور فکر و تجربہ بھی۔ یعنی شاعر وہ شخص ہے جس کے اندر یہ ساری قوتیں اعلیٰ اور عمدہ صورتوں میں موجود ہوں۔ اور کبھی کبھی داخلی یا خارجی تحریک کی بنا پر شاعر کے تخلیقی شعور (تخلیقیت) میں جو اُبال پیدا ہوتا ہے، اس کا موزوں، مناسب اور معنی خیز الفاظ میں، فنی و جمالیاتی تقاضوں کے ساتھ اظہار کا نام شاعری ہے۔ مشرقی زبانوں کی درسی کتابوں میں ابوالفرج قدامہ بن جعفر کی شاعری کی یہ تعریف ملتی ہے کہ:

> ''شاعری وہ کلام موزوں و مقفّٰی ہے جو کسی معنی پر دلالت کرے اور بالقصد کہا یا لکھا گیا ہو۔''

لیکن اس کے علاوہ بھی شاعری کے بارے میں مختلف النوع خیالات ظاہر کئے گئے ہیں جیسے:

(۱) شاعری تخیل کا نام ہے اور تخیل ایک ایسی قوت ہے کہ معلومات کا

PDF Compressor Free Version



ذخیرہ جو تجربہ یا مشاہدہ کے ذریعے سے ذہن میں پہلے سے موجود ہوتا ہے، یہ تخیل کی قوت اس کو دوبارہ ترتیب دے کر ایک نئی صورت بخشتی ہے اور پھر اس کو ایسے دلکش پیرائے میں جلوہ گر کرتی ہے جو معمولی پیرایوں سے بالکل یا کسی قدر الگ ہوتا ہے۔

(۲) شاعری حسین وبیش قیمت تجربات کا موزوں ومکمل بیان ہے۔

(۳) شاعری زندگی کے حقائق کی گہرائیوں، تصوف یا عرفان اور فلسفہ بیان کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔

(۴) شعر ایک قسم کی مصوری یا نقالی ہے، لیکن مصور صرف مادی اشیا کی تصویر کھینچ سکتا ہے اور شاعر ہر قسم کے خیالات و جذبات اور احساسات کی تصویر کھینچ سکتا ہے۔ یعنی شاعری کسی چیز کا اس طرح بیان کرنا ہے کہ اس کی اصلی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جائے یا وہی اثر دل پر طاری ہو جائے۔

(۵) شاعری وجدانی دنیا کا دوسرا نام ہے۔ شاعر اپنی فکر کی قوت، احساس کی ذکاوت اور خیال کی رفعت کے باعث وجدانیت (Intutionality) کی ہی ترجمانی کرتا ہے۔

(۶) شاعری خیال واحساس کے باطنی زمان ومکان کی توضیح وتعبیر ہے۔

(۷) شاعری ایک سلطنت ہے جس کی قلمرو اس قدر وسیع ہے، جس قدر خیال کی قلمرو اور یہ ایسا عالمگیر فن ہے جس سے نہ تو کوئی وحشی قوم معرا ہے اور نہ کوئی ترقی یافتہ قوم گریزاں۔

(۸) شاعری ایک وسیلہ ہے جس سے شاعر اپنے باطنی تجربے کو اوروں تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔ گویا اس کی شاعری واردات قلبی کا ایک آئینہ ہے جس میں اوروں کو بھی اپنے دل کی بات نظر آتی ہے۔

(۹) شاعری قوانین حسن وصداقت کی تابع تنقید حیات یا تفسیر حیات ہے۔

(۱۰) شاعری علم وفن سے بے نیاز علم کا نچوڑ اور جوہر لطیف یعنی بے ساختہ کلام ہے جو ہیجان کے ساتھ ساتھ وفور لذت کا سرچشمہ بھی ہے۔

(۱۱) انسان عالم یاس ونا اُمیدی یا عالم سرخوشی میں جو کچھ بھی محسوس کرتا ہے اگر اُسے کلام موزوں کی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کر دے تو اسے شاعری کہیں گے۔

(۱۲) شاعری ذوق حسن اور لطافت جذبات کی مصوری ہے۔

(۱۳) شاعری، تنہائی خاموشی اور سکون میں جذبات تازہ کرنے کا نام ہے اور زوردار احساسات کا بے ساختہ سیلاب ہے۔

(۱۴) شاعری وہ جادو یا اعجاز ہے جس کا کرشمہ یہ ہے کہ انسان کے خیالات اور احساسات اس کے جذبات داخلی کے سانچے میں ڈھل کر زبان سے نکلتے ہیں اور ایک عالم تصویر پیدا کر دیتے ہیں۔

(۱۵) شاعری کی روح نہ تو بلند وبالا نزاکت خیال میں ہے اور نہ ہی شعوری کوشش کے ساتھ الفاظ کے استعمال کرنے میں ہے بلکہ دل کی گہرائیوں میں ہے اور ان انسانوں کے قابل قدر جذبات میں ہے جو انھیں تحریر کرتے ہیں۔

شاعری کی ماہیت سے متعلق یہ ساری تعبیریں ہر چند ٹھوس، حتمی اور مستقل نہیں بلکہ اکثر بڑی حد تک مثالی ہیں، پھر بھی چونکہ ان میں دل کی گہرائیوں سے اُبھرنے والے، مسرت بخش اور بصیرت افروز جذبات و احساسات اور پُر جوش خیالات کے موزوں، مترنم اور موثر بیان کو شاعری قرار دیا گیا ہے، ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا ہے کہ حقائق زندگی، تصوف و عرفان، فلسفہ اور دیگر پاکیزہ جذبات کا اظہار کرنے والی شاعری بھی شاعری ہوتی ہے، اس لیے شاعری سے متعلق یہ تعبیریں شاعری کی جملہ اقسام، رنگ، مزاج، انداز بیان اور نظریات کا احاطہ کر لیتی ہیں چنانچہ میرؔ ہوں کہ غالبؔ، اقبالؔ ہوں کہ فیضؔ، شہریارؔ ہوں کہ پروین کمار اشکؔ ہر ایک کی شاعری الگ الگ رنگ اور مزاج رکھنے کے باوجود شاعری ہے، اعلیٰ اور ترقی یافتہ شاعری، البتہ ان کی شاعری میں جو فرق ہے وہ ان شاعروں کی تخلیقیت کی الگ الگ ساخت کی وجہ سے ہی ہے اور جیسا کہ شعور، لاشعور اور تخلیقی ادب سے متعلق جولیا کرسٹیوا کی توضیحات کے حوالے سے کہا گیا کہ کسی بھی شاعر کی شاعری کی تماش، رنگ، موضوعات اور نظریات کا تعین شاعر کے اسی ذہنی منطقے (Passage) میں ہوتا ہے جو حقیقی معنوں میں شاعر کی تخلیقیت کا منبع اور ماخذ ہوتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں تخلیقیت بیج ہے اور شاعری پودا۔ بیج اگر رومانی ہے تو پودے میں رومانیت کے ہی برگ وبار آئیں گے۔ بیج کی فطرت میں انقلابیت ہے تو شاخ وثمر بھی انقلابی رنگ ہی میں ہوں گے۔ دراصل کسی بھی شاعر (فرد یا فن کار) کی تخلیقیت (شاعری) اگر کسی

PDF Compressor Free Version



مخصوص رنگ، مزاج اور انداز کے سانچے میں ڈھلتی ہے تو اس کے پیچھے شاعر کے نسلی امتیازات، اجتماعی (قومی) لاشعور، ذوق جمال، فنی ولسانی آگہی، عصری سماجی و ثقافتی حالات، علم اور شعور اور ''شے'' کی حقیقت کو دیکھنے والی نظر اور حقیقت، اصل حقیقت کے شعری اظہار کا زاویہ وغیرہ متعدد عناصر اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ عناصر ہی شاعر کے اُس ذہنی منطقہ (Passage) میں فنی مہارت، جمالیاتی شعور اور اظہاری صلاحیتوں سے ہم آہنگ ہو کر اس کی شاعری کے وہ رنگ نمایاں کر دیتے ہیں جس کی بنا پر کسی کی شاعری کو ہم عشقیہ، صوفیانہ، انقلابی، ترقی پسند، ملی، جدید یا مابعد جدید شاعری کا نام دیتے ہیں یہی شاعری کا طلسم ہے اور اسی سے شاعری کی تخلیقیت کی پہچان ہوتی ہے۔ اب اگرچہ مابعد جدید تھیوریز سے بھی آگے اُردو ادب کا ''دوسرا وقت'' شروع ہو چکا ہے اور شاعری اور تخلیقیت کے حوالے سے پروفیسر گوپی چند نارنگ بھی کہہ چکے ہیں کہ:

> ''کلیت پسندی، آمریت، یکسانیت اور ہم نظمی تخلیقیت کے دشمن ہیں۔ تخلیقیت کو میکانکی کلیت کا اسیر کرنا اس کی فطرت کا خون کرنا ہے۔ تخلیقیت مائل بہ مرکز نہیں، مرکز گریز قوت رکھتی ہے۔ تخلیقیت آزادی کی زبان بولتی ہے۔ فقط قاری متن کو نہیں پڑھتا بلکہ متن بھی قاری کو پڑھتا ہے۔ ہر متن بدلتی ہوئی ثقافتی توقعات کے محور پر پڑھا جاتا ہے۔ معنی خیزی کا لامتناہی ہونا تخلیقیت ہی کی شکل ہے۔ ہر سچی تخلیق پرانے نظام کو بدلتی ہے اسی لیے نئے (نظام) کی نقیب ہوتی ہے۔ تخلیقیت کسی ایک مقام پر رُکتی نہیں، یہ ہر لحظہ جواں، ہر لحظہ جرات آزما، ہر لحظہ تازہ کار اور ہر لحظہ تغیر آشنا ہے۔''

دیکھا جائے تو رومانیت، کلاسیکیت، ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت سبھی ناگزیر تبدیلی، انحراف اور اجتہاد کے مختلف دائرے ہیں اور ان دائروں کے اندر، منفی اور مثبت ایسا بہت کچھ ہے جن سے اتفاق بھی کیا جا سکتا ہے اور اختلاف بھی، لیکن آج کی نئی فکریات یہ بتاتی ہے کہ شاعری (ادب) ذہنی تعیش نہیں، نعرہ بازی، فلسفہ اور علمیت کا اظہار بھی نہیں اور نہ ہی شاعری زندگی کی معنویت کی نفی ہے تو پھر آج برصغیر ہندو پاک کی تشویشناک، ہمہ جہت زوال پذیری کے پیش نظر کیا یہ ضروری نہیں کہ اُردو شعرا زندہ عصری مسائل اور حقائق کو اپنی تخلیقیت میں جذب کریں اور اُردو شاعری کے رسمی، مثالی اور فیشن پرستانہ طلسم کو توڑ کر عام انسانی زندگی، زمانہ اور ملک و قوم کے حوالے سے زیادہ تعمیری، معنی خیز اور ذمہ دارانہ تخلیقی رویہ اختیار کریں۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ کا منشا بھی غالباً یہی ہے:

> ''نئے عہد کی پیچیدگیاں، انسانی قدروں کا زوال، عالمی طاقتوں کی جنگ زرگری، تیسری دنیا کے ممالک کا استحصال، پسماندگی، افلاس، جہالت اور بے روزگاری ایسے بھیانک مسائل ہیں جو نئے اظہاری پیرایوں کا تقاضہ کرتے ہیں۔'' (گوپی چند نارنگ، دیباچہ، نیا اُردو افسانہ)

❁❁❁

## غالب: ناقدین کی نظر میں

☆ غالب کی غزل میں ایک عیش دوست، مگر سخت کوش امیر زادے کی تصویر ہمیں ملتی ہے، جسے زندگی سے بہت محبت ہے۔ یہ امیر زادہ عیش دوست ہونے کے باوجود خوش مذاق بھی ہے، اس کو چہ میں وہ اعلیٰ پسند ہے اور عظمت کا دلدادہ۔ رند مشرب ہے، مگر وضع و دستور قید کی حد تک نباہنا چاہتا ہے۔

(سید عبداللہ)

☆ غالب کے یہاں رنگارنگی اور فراوانی سے زیادہ ندرت، پیچیدگی اور تنوع اہم ہیں۔ ان کے یہاں جذبات کی تندی اور ذہن کی برق رفتاری بیک وقت ملتی ہے اور تعقل کا عنصر تمام دیگر عناصر پر فوقیت رکھتا ہے۔ (اسلوب احمد انصاری)

☆ غالب سے پہلے اردو شاعری کے پاس جذبات تھے، احساسات تھے، زبان و بیان کے کرشمے تھے، لیکن وہ حسین و شوخ ذہانت نہیں تھی جو پیکر الفاظ میں روح پھونک دیتی ہے۔ یہ مرزا کا عطیہ ہے اور اردو اس پر جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔

(خواجہ احمد فاروقی)

PDF Compressor Free Version

محمد انوار الحق تبسم

201, Manzari Apartment, Langar Toli Chauraha, Daryapur
Patna 800004 (Mob. 09525931214)

# پورنیہ: تہذیب وثقافت کے کچھ پہلو

موجودہ دور کے مورخوں اور عالموں نے بھلے ہی پورنیہ کی تہذیبی اور ثقافتی دین کی طرف کم توجہ مبذول کی ہوں، لیکن عہد قدیم سے ہی یہ پورا علاقہ اپنی زریں تاریخ اور اعلیٰ ثقافتی سرگرمیوں کے لئے مشہور رہا ہے۔ اسور گڑھ، بڑی جان گڑھ، بینو گڑھ، ننھا کنھا کا گڑھ دھرہرا، ٹھاکر گنج، کسم گڑھ، سیتلی گڑھ اور کرن دیگھی جیسے تاریخی مقامات کی باقیات کو دیکھنے سے پورنیہ کی تاریخی اور تہذیبی قدامت اور خصوصیات کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ مہابھارت، منوسمرتی، چینی سیاح، یو آن چوانگ کا سفرنامہ اور عہد وسطیٰ کی فارسی تواریخ، ''طبقات ناصری''، ''تاریخ فیروز شاہی''، ''تاریخ فرشتہ''، ''آئین اکبری''، ''مآثر عالمگیری''، سلیم اللہ کی ''تاریخ بنگالہ'' اور یوسف علی کی احوال مہابت جنگی میں، اس کے تذکرے ملتے ہیں۔

اٹھارہویں صدی کی قابل قدر فارسی کی تاریخی کتابوں، ''مظفرنامہ''، ''سیر المتاخرین'' اور ''ریاض السلاطین'' میں اس علاقے کا آنکھوں دیکھا حال پڑھنے کو ملتا ہے۔ انگریزی میں فرانسس بوکانن کی ''این اکاؤنٹ آف دی ڈسٹرک آف پورنیہ ان ۱۰-۱۸۰۹ء اومالے کی'' بنگال ڈسٹرکٹ گزیٹر، ''پورنیہ'' بنگلہ زبان میں بابو بھوائن سنگھ کی ''پورنیہ اتیو برتو'' اور اردو زبان میں یوسف رشیدی کی ''احسن التواریخ'' (تاریخ پورنیہ) اور اکمل یزدانی کی ''پورنیہ پر فوجداروں کی حکومت'' اس علاقے کی تاریخ اور ثقافت کے مختلف پہلوؤں پر قیمتی معلومات فراہم کرتی ہے۔ مشہور ومعروف ماہرین لسانیات گریرسن اور جان بیمز نے اس علاقے کی زبانوں اور ڈبلیو، ڈبلیو ہنٹر نے یہاں کی آبادی کا تذکرہ کیا ہے۔

کچھ مورخوں نے اس علاقے کو ستیہ یگ سے آباد بتایا ہے۔ اس زمانے میں پورنیہ راجہ ہرن کیشو کے زیر حکومت تھا۔ اس کے قلعوں کے باقیات اب تک موجود ہیں۔ ہندو روایات کے مطابق ستیہ یگ میں نرسنگھ اوتار کا پورنیہ میں ہی نزول ہوا تھا، جس مینار میں وہ ظاہر ہوئے وہ ''مانک تھام'' کے نام سے مشہور ہے۔ اس علاقے کے قدیم باشندے کول، بھیل، کیرات، پول، چین وغیرہ تھے۔ اس کے بعد آریوں کے دو خاندانوں انگ اور پنڈاری نے سکونت اختیار کی۔ مشرقی حصے میں مہانندا ندی سے مشرق میں پنڈاری اور مغربی حصے میں انگ قبیلے کے لوگ سکونت پذیر تھے۔ مغربی سرحد کوسی ندی تھی۔ پنڈاریوں کی شمالی سرحد پر کیرات قبیلے کے لوگ آباد تھے۔ اسی قبیلے میں راجہ بھرت کی ایک رانی کرنتی نام کی تھی، جس نے پانڈوؤں کے ''بن واس'' کے زمانے میں ٹھاکر گنج میں واقع اپنے قلعے میں انہیں پناہ دی تھی۔ اس قلعے کہ باقیات اب تک موجود ہیں۔ اومالے کے مطابق انگ قبیلے کے لوگ چھ سات سو قبل مسیح سے یہاں اقامت پذیر تھے۔ پانڈوؤں نے اپنے ''بن واس'' کے لئے ویدویاس سے مشورہ طلب کیا تو انہوں نے ویراٹ راجیہ، جو موجودہ کشن گنج ضلع کے شمالی، مغربی حصے اور نیپال کی ترائی پر مشتمل تھا، جانے کی صلاح دیتے ہوئے کہا کہ سب سے دھنی سب سے سکھی اور سب سے اچھی آب وہوا والا راجیہ راجہ ویراٹ کا ہے، جہاں دودھ کی نہریں بہتی ہیں۔ اناج کا انبار لگا رہتا ہے، بہترین سوتی کپڑے تیار ہوتے ہیں اور جنگلوں کی ہریالی میں ہرنیں چوکریاں بھرتی ہیں، وہیں جا کر رہیں۔

۵۱۹ قبل مسیح میں مگدھ کا راجہ بمبسار انگ قبیلے کے راجہ کو شکست دے کر پورنیہ پر قابض ہو گیا، پھر یہ علاقہ گپت راجاؤں کے زیر نگین آ گیا۔ اس کے بعد یہ راجہ بالادتیہ کے ماتحت رہا۔ چینی سیاح یوآن

PDF Compressor Free Version



چوانگ کے سفرنامے سے جو ۶۴۰ء میں گنگا ندی پار کر کے یہاں پہنچا تھا پتہ چلتا ہے کہ مہاتما گوتم بدھ یہاں تین مہینوں تک رہ کر اپنے دھرم کا پرچار کرتے رہے۔ اس سفرنامہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ بودھ راجاؤں نے یہاں حکومت کی۔ اس نے تین ہزار بودھوں اور ۲۰ بودھ مٹھوں کی یہاں موجودگی کا تذکرہ کیا ہے۔ ۶۴۷ء تک یہاں ان کی حکومت قائم رہی۔ یوآن چوانگ نے اس خطے کا نام ''پن، نا فاٹن، نا، پن، نا۔ وو۔ دھنا'' لکھا ہے، جسے فرگوسن نے موجودہ رنگ پور بتایا ہے، جو اس زمانے میں پورنیہ کا مشرقی علاقہ تھا۔ اس نے اس خطے میں بھری پوری آبادی، تالابوں، سرایوں اور باغیچوں کا ذکر کیا ہے۔ اس نے یہاں کی فصلوں اور پھولوں کی کثرت کا خاص طور سے کنھل کا ذکر کیا ہے۔ اس نے یہاں کی آب و ہوا کو خوشگوار، زمین کو نشیبی اور نم، عوام کو علم دوست بتایا ہے۔ اس خطے پر پال اور سین خاندان کے راجاؤں کا بھی تسلط رہا۔ بابو بھوانن سنگھ کے مطابق آخری راجہ لکشمن سین نے اپنے عہد حکومت میں پورنیہ شہر کو آباد کیا۔

مسلمانوں نے دلی سلطنت کے قیام سے قبل ہی اس خطے پر قبضہ کر لیا تھا بختیار خلجی نے ۱۲۰۰ء میں لکشمن سین کو شکست دے کر اپنا تسلط جمالیا اور نادیا کی بجائے لکھنوتی یا گوڑ کو یہاں کا دارالحکومت بنایا یہی پوربی راجیہ ہے جسے بنگالہ بھی کہا گیا ہے۔ فرشتہ کے مطابق سونار گاؤں، لکھنوتی، بہار، جاجنگر اور اس کے سرحدی خطے کو مشرقی سلطنت کہتے تھے یہی وہ بنگالہ ہے جس کے حکمراں غیاث الدین (۱۳۱۰۔۱۳۹۳ء) نے ایران کے مشہور شاعر حافظ شیرازی کو بنگال آنے کی دعوت دی تھی۔ وہ سندھ ندی تک آ کر لوٹ گئے تھے اور سلطان کی خدمت میں ایک غزل بھیج دی جس کے ایک شعر نے ہندوستان میں دھوم مچادی۔

شکر شکن شوند، ہمہ طوطیان ہند
زین قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

اس غزل کے مقطع نے سلطان کو زندہ جاوید بنا دیا۔

حافظ ز شوق مجلس سلطان غیاث دین
خامش مشو کہ کار تو از نالہ می رود

۱۲۰۰ء سے ۱۷۷۰ء تک پورنیہ دلی اور بنگال کے سلطانوں، مغل حکمرانوں، بنگال کے صوبہ داروں کے ماتحت رہا۔ اس عہد میں کئی فیصلہ کن جنگیں لڑی گئیں، جن میں ہمایوں اور شیر شاہ، سراج الدولہ اور شوکت جنگ کے درمیان کی جنگیں بھی شامل ہیں۔ ان جنگوں نے ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کیا۔ اس خطے کو فوجداروں کے عہد حکومت میں بڑی خوشحالی ملی جو بنگال کے صوبہ داروں کے ماتحت تو ہوا کرتے تھے، لیکن دلی کی مرکزی سرکاروں سے بھی ان کا براہ راست تعلق ہوتا تھا۔ استوال خان کی بحیثیت فوجدار یہاں تقرری سے پہلے ہمارے پاس فوجداروں کی تقرریوں کے متعلق کسی قسم کی جانکاری یا فہرست موجود نہیں ہے۔ اومالے نے پورنیہ گزیٹر میں استوال خاں سے محمد علی خان تک سترہ فوجداروں کی فہرست دی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان فوجداروں کی تقرریاں سترہویں صدی کے نصف آخر یعنی اورنگ زیب (۱۶۵۸۔۱۷۰۷) کے عہد حکومت میں ہوئیں۔ ان فوجداروں میں اسفندیار خان، سیف خان، صولت جنگ ایسے فوجدار ہوئے ہیں، جنہوں نے اس خطے میں فن و ثقافت اور ادب کی ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ فوجداروں کے عہد حکومت کی یادگاروں میں جلال گڑھ کا قلعہ کافی مشہور ہے، لیکن بعض مصنفین اسے خلجی عہد کی یادگار بتاتے ہیں اور لکھا ہے کہ محمد بن تغلق کی جو فوج تبت اور چین کی مہمات پر بھیجی گئی تھی، وہ جلال گڑھ کے قلعہ میں کچھ دنوں آرام کے لئے رکی تھی۔

پورنیہ کے فوجداروں میں سیف خان کا عہد حکومت فتوحات، اقتصادی خوشحالی اور ثقافتی سرگرمیوں کے لئے بے حد اہم تسلیم کیا جاتا ہے۔ سیف خان کابل کے صوبہ دار امیر خان کا پوتا تھا اور اپنی شجاعت، دور اندیشی اور تجربہ کاری کے لئے شہرت رکھتا تھا۔ پورنیہ اس زمانے نیپالیوں، چکواروں اور بیر نگر کے راجہ درجن سنگھ کے درمیان جنگوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ان باغیوں کی سرکوبی کے لئے بنگال کے صوبیدار مرشد قلی خان (۱۷۲۵۔۱۷۰۴) کی گزارش پر اورنگ زیب نے سیف خان کو پورنیہ کا فوجدار بنایا اور اسے دھرم پور گوندوارہ کی جاگیریں عطا کیں، مگر اخراجات کے لئے ان علاقوں کی آمدنی کم پڑتی تھی، چنانچہ انہوں نے اورنگ زیب سے شکایت کی۔ ''ریاض السلاطین'' کے مطابق شہنشاہ اورنگ زیب نے مرشد علی خان کو لکھا کہ:

''میں نے تمہیں شیر کو پنجرے میں بند کر کے دیا ہے اگر اسے

PDF Compressor Free Version



پوری خوراک نہ دوگے تو وہ تمہیں نقصان پہنچائے گا۔"

مرشد علی خان نے تمام بقایا جات معاف کر کے اسے اس خطے کا مختار کل بنا دیا۔ سیف خان نے اپنے اختیارات کا فائدہ اٹھا کر بیر نگر کے راجہ کو شکست دے کر قدیم کوسی کے مغربی کنارے تک کو پورنیہ میں شامل کر لیا، باغیوں کو سزائیں دیں اور نیپالیوں کو پہاڑ تک کھدیڑ دیا۔ اس نے جنگلوں کو صاف کرایا اور اس علاقے کو آباد کرنے کا جامع منصوبہ بنایا اور زراعت کی سرپرستی کی۔ یہاں کی آمدنی جو دس، گیارہ لاکھ تھی۔ اٹھارہ لاکھ تک پہنچ گئی اور عوام امن وچین سے رہنے لگے۔ سیف خان نے کوسی کے مغربی کنارے تک فتح حاصل کر کے اس علاقے میں فصلی سنہ اور کوسی کے مشرقی علاقے میں بنگلہ سنہ کو نافذ کیا۔

سیف خان کی یادگاروں میں پورنیہ سیٹی میں ایک مسجد اب تک موجود ہے۔ سیف گنج یا موجودہ کٹیہار کو بھی اسی نے بنایا تھا۔ سیف خان نے ادب وثقافت کی بھی سرپرستی کی اس کے عہد میں شیخ کفایت اللہ نے بنگلہ ۱۱۳۶ مطابق ۱۷۲۸ء میں مشہور پریم کتھا "ودیا دھر" کی تخلیق مقامی زبان اور رسم الخط میں کی۔ اس پریم کتھا میں اس عہد کی سیاسی، سماجی اور ثقافتی زندگی کی نہایت خوبصورت عکاسی ملتی ہے۔ پریم کتھا کی صنف میں بہار میں یہ اکلوتی تخلیق ہے۔

اس پریم کتھا میں آئے دن کے مسائل اور ان کا حل، امراض اور ان کے علاج، علم نجوم اور جنسیات سب کچھ ہے۔ ایک آدمی کو پیدائش سے موت تک جن حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان کا تذکرہ اس میں اصل کہانی کو آگے بڑھاتے ہوئے موجود ہے، مگر کہیں یہ پتہ نہیں چلتا ہے کہ قاری کہانی سے الگ کچھ پڑھ رہا ہے۔ "ودیا دھر" شعر وشاعری کا ایک عمدہ شاہکار ہے۔

یہ پریم کتھا کیتھی رسم الخط کے ساتھ ساتھ بنگلہ رسم الخط میں بھی لکھی گئی تھی، اس لئے بنگلہ شاعروں بالخصوص رابندر ناتھ ٹیگور پر اس کا کافی اثر ہے، کچھ اشعار پیش ہیں۔

شاعر کا گاؤں ؎

پورنیہ سے پورب نیر ایک گاؤں
پر گنہ حویلی دمکا ناؤں

کتھا سورس ودیا سنگ آوا
ہیجھا سپورن سبھی کہاوا
مورکھ سنے گیان گتی پاوے
پنڈت کے پنڈتیائی بڑھاوے
مسلمان مسئلہ کے بوجھے
ہندو کے مارگ ویدھی سوجھے

سہاگ رات ؎

کچھ ہلسے، کچھ ڈرے من ماہی
پوروکھ ہیو ہم جانے ناہی
ترونہ سوامی ہم ابلہ، تھر تھر کانپے انگ
چیت ہے نیم، بیساکھے بیلا
سگرو جیٹھ بہنتا بھات ٹھیلہ

صولت جنگ کی عہد فوجداری (۵۶-۱۷۵۱ء) میں بھی ادب ثقافت کی سرپرستی ہوئی۔ مشہور مورخ غلام حسین طبا طبائی سات سالوں تک اس کے دربار میں رہا اور ان کے ولی عہد شوکت جنگ کا اتالیق مقرر ہوا۔ اس نے ۱۷۸۲ء میں "سیر المتاخرین" لکھی جو اٹھارہویں صدی کے ہندوستان کی اہم ترین تاریخ تسلیم کی جاتی ہے۔

۱۷۷۰ء میں پورنیہ کے فوجداروں کی حکومت ختم ہوگئی اور مسٹر ڈوکریل کی تقرری کے ساتھ ہی، جو آگے چل کر ضلع کلکٹر کہلائے، پورنیہ میں برطانوی حکومت کا قیام عمل میں آگیا۔ اس عہد کی ثقافتی سرگرمیوں میں سب سے اہم پورنیہ ضلع اسکول کا قیام ۱۸۵۲ء میں اور مدرسہ محمدیہ اسلامیہ رحمت کا قیام ہے اس مدرسے کو محمدیہ اسٹیٹ کے زمیندار شیخ امیر بخش اور ان کے بھائی شیخ محمد آغا ولد شیخ رحمت اللہ مرحوم نے ۲۷ محرم ۱۳۱۷ھ مطابق (۸۹-۱۸۸۸ء) میں قائم کیا۔

یہ مدرسہ پچھلے سو سال سے بھی زیادہ مدت سے تعلیم و تعلم میں مصروف ہے۔ شیخ امیر بخش نے اپنے وقف نامہ ۲۱۵ میں جو ۶۵ صفحات پر مشتمل ہے، مدرسے کے قیام کی ضرورت اور اہمیت پر زور دیتے ہوئے اعلیٰ تعلیم کا نظم کیا اور چالیس طلبا کے مفت طعام و قیام کے لئے موضع لکھنا اور دو گھریا میں ۱۵۰ ایکڑ سے بھی زیادہ زمین وقف کی

PDF Compressor Free Version



اور درس وتدریس کے لئے کئی کمروں پر مشتمل ایک پختہ عمارت بھی تعمیر کرایا۔ یہ مدرسہ اب تک موجود ہے، لیکن یہاں صرف ابتدائی تعلیم کا ہی نظم ہے، جب کہ آزادی سے قبل تک اس مدرسے نے تعلیم کی اشاعت میں اہم کردار ادا کیا۔ اس مدرسے سے تعلیم حاصل کرنے والوں میں اس علاقے کی متعدد اہم شخصیتیں ہیں، جنہوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں خدمات انجام دیں۔

اس سلسلے میں خاص طور سے علمی اور سیاسی رہنماؤں میں محمد طاہر، محمد طیب، حبیب الرحمٰن، حسیب الرحمٰن، جمیل الرحمان اور تسلیم الدین اور روحانی پیشواؤں اور سماجی کارکنوں میں مولانا محمد ابراہیم (ہاٹ گاچھی) مولانا عابد حسین (کٹیہار) حافظ قطب الدین (ایجالو) الحاج حیدر علی رحمانی (حیدر نگر) مولانا منور حسین اور مولانا محمد امام الدین (کشن گنج) حافظ محمد اسحاق (گیرکی) منشی محمد سلطان (لکھنا) مولانا عبدالرزاق (پرسرائی) مولانا محمد ادریس (لوکانی) وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ ایک انگریزی کتاب ''پورنیہ: اے شکار لینڈ'' جس کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اسے راج بنیلی کے پروپرائٹر راجہ کرتیانند سنگھ نے لکھا اور ۱۹۱۴ء میں کلکتہ سے شائع کیا۔ اس میں مصنف نے پورنیہ کو دنیا کی مشہور شکار گاہوں میں دکھلانے کی کوشش کی ہے۔ راج بنیلی اب ایک اجاڑ گاؤں ہے، راج پریوار کے لوگ چمپا نگر، شری نگر، گڑھ بنیلی پورنیہ، بھاگل پور اور پٹنہ میں بس گئے ہیں، لیکن قصبہ بلاک کے شمال ومغربی حصے میں واقع راج بنیلی کبھی سنسکرت علوم اور متھلا ثقافت کا اہم مرکز تھا۔

بیسویں صدی میں بھی زندگی کے مختلف شعبوں میں بعض ایسی شخصیات پیدا ہوئیں جن میں سے بعض نے قومی اور بین الاقوامی شہرت حاصل کی۔ پاکستان کے صدر سکندر مرزا کی پیدائش اور پرورش ان کے ننہال کھگڑا اسٹیٹ میں ہوئی۔ بنگلہ دیش جنگ آزادی کے رہنما شیخ مجیب الرحمٰن نے اپنی ابتدائی تعلیم پورنیہ ضلع اسکول میں حاصل کی۔ شری لکشمی نرائن سدھانشو اور شری رام نرائن منڈل لمبے عرصے تک بہار اسمبلی کے اسپیکر رہے۔ شری بھولا پاسبان شاستری کا شمار بہار کے نیک نام وزرائے اعلیٰ میں ہوتا ہے۔ مولوی محمد طاہر نے میونسپل الیکشن میں راجہ پی۔ سی۔ لال کو شکست دے کر اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کیا اور ایک لمبے عرصے تک بہار اسمبلی اور پارلیامنٹ کے رکن رہے اور عوامی فلاح و بہبود کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ کھیل کود بالخصوص فٹ بال میں متعدد لوگوں نے امتیاز حاصل کیا۔

عبدالصمد بین الاقوامی شہرت کے حامل فٹ بالر ہوئے جنوبی بنگال کے مشہور محمڈن اسپورٹنگ کے قیام میں کھگڑا کے نوابوں نے کلیدی کردار ادا کیا۔ مشہور اداکارہ اور دیوداس کی ہیروئن سچترا سین کی پیدائش اور پرورش پورنیہ میں ہوئی۔ فارسی، ہندی، بنگلہ اور اردو زبانوں کے متعدد ادبا اور شعرا قومی سطح پر جانے گئے۔ بھونیشور ناتھ رینو کا شمار ہندی کے بین الاقوامی سطح کے کہانی نویسوں میں ہوتا ہے۔ ان کی کہانی پر ''تیسری قسم'' جیسی اعلیٰ فلم بنی جس میں اس علاقے کی تہذیب و تمدن اور بول چال اور سادہ زندگی کی بہترین عکاسی کی گئی ہے۔ بنگلہ فلم ہائیر۔ بازار کے تخلیق کار بھی کٹیہار کے باشندہ تھے مشہور صنعت کار اور ''سہارا انڈیا'' کے سہارا شری سبرتو رائے کے خاندان کا تعلق اراریہ ضلع سے ہے۔ پورنیہ کے متعدد بنگلہ ادیبوں کو ساہتیہ اکادمی کے ایوارڈس بھی مل چکے ہیں۔ ❁❁

## فلم کار حضرات توجہ دیں

اپنی تخلیق کے ساتھ اپنا نام جو آپ کے بینک اکاؤنٹ میں ہے، انگریزی میں ضرور لکھیں، ساتھ ہی بینک کا نام و پتہ، اکاؤنٹ نمبر اور IFSC Code بھی تحریر کریں۔

اپنا موبائل نمبر اور مکمل پتہ بھی انگریزی میں تحریر کریں تاکہ آئندہ آپ کے معاوضے کی رقم سیدھے آپ کے اکاؤنٹ میں جمع کر دی جائے اور آپ کو دشواری نہ ہو۔

اس اعلان کو خاص طور پر وہ سبھی فلم کار بھی نوٹ فرمالیں جن کا کسی بھی طرح کے لین دین کا تعلق بہار اردو اکادمی سے ہے۔

—— سکریٹری

PDF Compressor Free Version



ڈاکٹر تحسین فاطمہ

C/o Dr. Syed Ali Akhtar, Maharaja Road, Chandwara, Muzaffarpur

# نثریات شبلی کی عظمت فراواں

اردو ادب میں علامہ شبلی نعمانی کا نام اور ان کا مقام کسی تعارف کا دست نگر نہیں۔ انہوں نے اگر چہ کچھ زیادہ عمر نہیں پائی۔ وہ ۱۸۵۷ء میں اس جہان رنگ و بو میں آئے اور ۱۹۱۴ء میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے، لیکن اس مختصر سی زندگی میں بہر صورت انہوں نے اپنی محنت، لگن، علمیت، ژرف بینی اور دقت نگاہی سے اردو ادب و تاریخ، فلسفہ و کلام اور انشاء و تنقید کو جو عظیم اور مثالی سرمایہ عطا کیا وہ یقیناً بھلایا نہیں جا سکتا۔ بقول سہیل عظیم آبادی:

''شبلی نعمانی کی ذات ان چند بزرگوں میں سے ہے جنہوں نے اردو زبان کو علمی زبان بنایا۔'' (دیباچہ انتخاب نثر اردو، مطبوعہ ایوان اردو، پٹنہ ص ۱۷)

بلاشبہ شبلی نے اپنے علم و قلم سے اپنے دور میں سیاسی، سماجی، تہذیبی اور علمی و فکری سطح پر قدیم و جدید کی عمدہ ترین آمیزش کے ساتھ، داعی و نقیب ہونے کا جو پر خلوص فریضہ انجام دیا ہے، وہ ہماری ادبی و علمی اور ثقافتی تاریخ کا ایک درخشاں باب ہے۔ خصوصاً اردو زبان و ادب کی تاریخ، نثریات شبلی کی عظمت فراواں کبھی فراموش نہیں کر سکتی، کیوں کہ ان کی تصنیفات اور ان کے پر مغز مقالات نے اردو نثر کی علمی و فنی حیثیت کو صرف بلند ہی کیا ہے بلکہ اسے زبردست رونق و استحکام بھی بخشا ہے۔ یقیناً ان کے قلم سے اگر باندازِ خاص نثریات کی خشت اول نہ رکھی جاتی تو وہ کاخ علم و اب بھی تیار نہ ہوتا جس کے معماروں میں علامہ سید سلیمان ندوی اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے اساطین فکر و فن کے نام شامل ہیں۔

نقد ادب کی دنیا میں ''غالبیات'' اور ''اقبالیات'' کی طرح ''شبلیات'' بھی یقینی طور پر مطالعہ کا ایک مستقل موضوع رہا ہے اور اس تعلق سے ''حیات شبلی''، ''یادگار شبلی''، ''شبلی ایک دبستان''، ''شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں'' اور ''شبلی نقادوں کی نظر میں'' جیسی کتابوں کا نام بلا تکلف لیا جا سکتا ہے جن میں شبلی کی زندگی اور ان کے ادبی کارناموں کی مختلف جہتیں ایک خاص نظریاتی و تجزیاتی وزن و وقار کے ساتھ سمٹ آئی ہیں اور وہ قاری کو اس بات کا معترف بنانے میں بہر صورت کامیاب ہیں کہ:

''واقعی شبلی نے اردو نثر کے اس مکدر اور بدنما ہیرے کو اپنے زور قلم سے کوہ نور ہیرا بنا دیا جسے سرسید نے ناتراشیدہ روپ میں کان سے نکالا تھا۔'' (مقدمہ شمع ادب مرتبہ کوثر یزدانی، مطبوعہ فیض آباد، ص ۸۴)

علامہ شبلی نعمانی کا شمار اردو کے عناصر خمسہ میں ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہ سرسید اسکول سے تعلق رکھتے تھے بلکہ بقول ڈاکٹر سلام سندیلوی:

اس دبستان ادب میں سرسید کے بعد اعلیٰ صلاحیتوں کی مالک شبلی ہی کی ذات تھی۔'' (تجربہ و تجزیہ ص ۳۳۸)

بیشک شبلی نے ایک زبردست و فعال شخصیت پائی تھی اور وہ تا حین حیات اپنی بہترین صلاحیتوں سے جہان علم و ادب کو نوازتے رہے۔

شبلی ۱۸۸۲ء میں علی گڈھ آئے اور یہاں کی ابتدائی زندگی میں انہوں نے تاریخ اسلام کی دو اہم کڑی کے طور پر ''المامون'' اور ''سیرۃ النعمان'' تصنیف کی، بعد ازیں جب ۱۸۹۲ء میں انہیں اسلامی ملکوں کی سیاحت و زیارت کا موقع ملا تو وہاں سے واپسی پر انہوں نے ''سفر نامہ روم و شام'' لکھا۔ ۱۸۹۹ء میں جب کہ شبلی کا قیام اعظم گڑھ میں تھا، انہوں نے ''الفاروق'' نامی کتاب تصنیف کی اور پھر اس زمانے میں جب کہ وہ حیدر آباد میں تھے، انہوں نے ''الغزالی''، ''سوانح مولانا روم''، ''الکلام''، ''علم الکلام'' اور ''موازنہ انیس و دبیر'' جیسی معروف کتابیں لکھیں۔ علاوہ ازیں تصانیف شبلی کے تعلق سے ''سیرت النبی صلی اللہ

PDF Compressor Free Version



علیہ وسلم''، ''شعر العجم''، ''اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر''، ''الجزیہ''، ''مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم''، ''تاریخ اسلام و فلسفہ اسلام''، ''حیات خسرو'' اور ''تنقید جرجی زیدان'' بھی بھلائی نہیں جاسکتیں۔ شبلی کی ان تصانیف اور مزید برآں ان کے بہت سارے علمی، تنقیدی، مذہبی، ادبی، تاریخی اور تعلیمی مقالات کے مطالعہ سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ بحیثیت مجموعی شبلی کا نثری ادب بے پناہ افادات و اضافات کا حامل اور گوناگوں امتیازات کا مرقع ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بقول سید وقار عظیم:

''اردو کا کوئی مصنف عام طور سے اپنی تصانیف میں تحقیق و تدقیق سے اتنا کام نہیں لیتا ہے، جتنا کہ مولانا شبلی نے لیا۔'' (اقبال ادب، مطبوعہ لاہور ص ۱۲)

بیشک شبلی کی تاریخی و سوانحی کتابیں اپنے موضوع و مواد اور انداز پیش کش کے لحاظ سے معلومات کا بیش بہا خزینہ ہیں اور بحیثیت مورخ و سوانح نگار وہ اپنے معاصرین سے آگے ہی نہیں، بہت آگے ہیں۔ حالی اور شبلی کا نام بالعموم ساتھ ساتھ لیا جاتا ہے، لیکن سچائی یہ ہے کہ ان دونوں کے یہاں موضوعات کے انتخاب اور مواد کی یکجائی میں بہت ہی خاص تفاوت نظر آتا ہے اور صاف محسوس ہوتا ہے کہ تاریخ و سوانح کی پیش کش میں شبلی کا معاملہ حالی سے بالکل مختلف تھا:

''شبلی چونکہ راجپوت خاندان سے تعلق رکھتے تھے اس لئے ان کی طبیعت میں جوش و ولولہ پایا جاتا ہے، انہیں وراثت میں شاہانہ مزاج ملا تھا اس لئے انہوں نے ان شخصیتوں پر قلم اٹھایا جن کے پرتو میں وہ تمام اوصاف پائے جاتے ہیں، جن کا حامل وہ خود اپنی شخصیت کو دیکھنا چاہتے تھے۔''

(اردو کی نثری تاریخ میں سرسید کا مقام، ۱۹۷۷ء ص ۹۰)

شاید یہی وجہ ہے کہ شبلی نے انتخاب موضوع میں ایک خاص شعور اور ترجیحی پسند سے کام لیا، مستند ترین حوالوں سے اپنی کتابیں مزین کیں اور تقلید کی بجائے ہمیشہ تحقیق کی شاہ راہ پر گامزن رہے اور اس طرح گویا اپنی نثریات کے ذریعہ اردو میں سوانح اور فن تاریخیت کا معیار بلند و مستحکم کر دیا۔ بقول مہدی افادی:

''شبلی نعمانی وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے مذہب کے ساتھ تاریخ اور فلسفہ میں باہمی ربط پیدا کیا ہے۔''

اور بقول ڈاکٹر سید عبداللہ، کارلائل، گبن، رینکی اور دیگر مغربی مفکرین کے فلسفہ تاریخ سے استفادہ کرتے ہوئے:

''اردو کے نثری ادب میں تاریخ کو موضوع بنا کر اس لحاظ سے شبلی نے اردو ادب کی شان نہایت بلند کر دی ہے کہ ان کی نثری تحریروں کے ذریعہ ہی اردو میں پہلی مرتبہ تاریخی کتابوں کے اندر تحقیقی عناصر کی شمولیت ہو سکی۔ ان کی تاریخی کتابوں میں جدید رجحانات کے پرتو ملتے ہیں اور ان میں وہ دلچسپی، کیف اور خاص اسلوب بھی ہے جو اس سے پہلے اردو میں لکھی گئی اس موضوع کی کتابوں کو نصیب نہ تھا۔'' (میرا من سے عبدالحق تک، ڈاکٹر سید عبداللہ)

بیشک ابتداً اگرچہ تاریخ و سوانح کا ذوق فیضان سرسید سے پایا، مگر بعد میں بقول سید عبداللہ:

''انہوں نے تاریخ سے ہٹ کر ترقی کے نظریہ کو مرکز توجہ بنالیا اور ماضی سے زیادہ حال اور مستقبل کو سامنے رکھنے لگے، بیشک اسلامی تاریخ نگاری کی اصول بندی نثریات شبلی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔''

(اردو ادب کی ایک صدی، ۱۹۸۹ء ص ۷۱)

شبلی نعمانی اپنی نثریات میں نہ صرف ایک مورخ اور سوانح نویس بلکہ ایک نقاد اور متکلم کی حیثیت سے بھی اپنی اہمیت کا احساس دلاتے ہیں۔ انہوں نے اگر ''الفاروق'' جیسی کتاب ان لوگوں کے لئے لکھی جو تشیعت میں غلو کے شکار ہو رہے تھے تو ''سیرۃ النعمان'' جیسی کتاب ان لوگوں کی خاطر سپرد قلم کی جو تو ہب میں مبتلائے غلو تھے اور پھر ''الکلام'' ان کے لئے جو مسیحی عقیدے میں انتہائی غلو پسندی سے کام لے رہے تھے۔ بیشک شبلی نے اپنی نثریات میں اس طرح علم کلام کے تعلق سے جدید فلسفے کو سامنے رکھتے ہوئے ایسی توازن پسندی کا نمونہ پیش کیا ہے جو تادیر نظر انداز نہیں ہو سکتا۔

بیشک مذہبیات و علمیات اور اردو زبان و ادب کے لئے

PDF Compressor Free Version



شبلی کی نثریات کا مرتبہ ایک نہیں انیک پہلوؤں سے روشن اور منفرد ہے۔ انہوں نے ''علم کلام'' جیسی کتاب لکھ کر گویا پہلی مرتبہ اپنی نثریات کے ذریعہ اردو میں علوم وفنون کی تاریخ لکھے جانے کی طرح ڈالی ہے۔ بیشک مختلف موضوعات پر شبلی نے اپنی کتابوں میں تحقیق و تدقیق، جزئیات نگاری، کثرت معلومات، حسن سبک اور حسن انتخاب کے جو کامیاب نمونے ہمیں دیے ہیں وہ یہ بتا دیتے ہیں کہ ان کی نثریات کا مرتبہ کسی طرح حالی سے کم نہیں، بلکہ بہ وجوہ سے اس پر فوقیت رکھنے والا بھی ہے اور لطف یہ ہے کہ خود حالی کو بھی اس سے انکار نہیں، انہوں نے شبلی کے بارے میں صاف لفظوں میں لکھا ہے کہ:

''انہوں نے اپنی ہر ایک پہلی تصنیف میں جس بلندی پر اپنے کو دکھایا ہے اس سے بعد کی تصنیف میں ان کی لیاقت اور روشن دماغی اس سے بلند تر منظر پر جلوہ گر ہوئی ہے۔''

(علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، بحوالہ مونوگراف شبلی، ظفر احمد صدیقی)

جہاں تک شبلی کی سیرت نگاری کا تعلق ہے، ان کی کتاب ''سیرت النبی'' بہر صورت جدید اذہان کو مطمئن کرنے میں کامیاب ہے، انہوں نے اس میدان میں اپنے معترضین کے اعتراضات واشکال اور ان کی در پردہ نیتوں کا خاص شعور رکھتے ہوئے اپنا تحقیقی وتجزیاتی مطالعہ تمام تر نظریاتی متانت وصلابت کے ساتھ پڑھنے والوں کے سامنے لا دیا ہے اور اس توسط سے اپنی نثریات کو محض اظہار عقیدت سے بچانے میں پوری طرح کامیاب ہیں۔ شبلی کا دور مسیحی مصنفین اور مسلکی معترضین کی بے پناہ شرارتوں کا خاص دور تھا اور اسے ملحوظ رکھتے ہوئے شبلی نے بلاشبہ سوانحی، تاریخی اور کلامی تصانیف کا جو سرمایہ اردو ادب کو دیا ہے وہ یادگار زمانہ ہے۔

مولانا شبلی نعمانی ایک متکلم ہی نہیں ایک مورخ ونقاد بھی ہیں اور اس تعلق سے ''شعر العجم'' اور ''موازنہ انیس ودبیر'' کے علاوہ ''سوانح مولانا روم'' بھی ان کی باقیات میں شامل ہے۔ ظاہر ہے کہ ''شعر العجم'' فارسی شاعری کی تاریخ ہے اور اس میں پہلی اور چوتھی جلد میں شاعری کے نظریاتی وعملی پہلوؤں پر جو کچھ لکھا گیا ہے اسے یقیناً ایک بڑے پارکھی کی گہری اور انمول پرکھ کہنا غلط نہ ہوگا اور پھر یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ''موازنہ'' تو شبلی کی وہ کتاب ہے جس سے اردو میں تقابلی تنقید کی بنیاد پڑتی ہے جو شبلی کی نثریات کا بڑا فیضان ہے۔ بیشک انہوں نے اردو تنقید کو اپنے ایسے متانت بداماں نظریات سے نوازا ہے جس میں ان کی علمیت اور ژرف نگاہی کے ثبوت قدم قدم پر ملتے چلے جاتے ہیں، اتنا ہی نہیں بلکہ شبلی نے جو سفرنامہ لکھا ہے اور ان کے خطوط کا جو سرمایہ ہم تک پہونچا ہے، اس کے مطالعہ سے بھی نثریات شبلی کی عظمتوں کا احساس ہوتا ہے۔

شبلی کا سفرنامہ بتاتا ہے کہ انہوں نے دیار اسلامی کو اسی نگاہ سے دیکھا اور دکھایا ہے جو اس کے شایان حال ہے اور ان کے خطوط بتاتے ہیں کہ انہوں نے کہیں بھی ادبیت اور دلچسپی کے عناصر کی شمولیت نظر انداز نہیں ہونے دی ہے۔ مزید برآں اگر شبلی کے مقالات پر نظر ڈالی جائے تو یقیناً اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے بہر حال اپنے معاصرین کے رنگ کی محض تقلید نہیں کی ہے اور خاص بات یہ بھی ہے کہ انہوں نے جو جوابی مضامین لکھے ہیں ان میں بھی کہیں فکری بے اعتدالی، دلائل کے فقدان اور علمی عدم توازن کی خامیاں نہیں آنے دی ہیں۔ بقول آل احمد سرور:

''انہوں نے ہمارے ادب میں علم کی گہرائی اور علم میں ادب کی تازگی پیدا کی ہے۔'' (تنقیدی اشارے ص ۲۱۰)

بیشک شبلی کی نثریات یہ بتانے کے لئے کافی ہے کہ بقول سید سجاد ظہیر:

''وہ اسلامیان ہند کی تہذیبی زندگی کے اس موڑ کے رہنما ہیں جہاں پر سرسید کا بنایا ہوا راستہ تاریخی اعتبار سے ختم ہوتا ہے اور وہ شاہراہ آزادی شروع ہوتی ہے جس پر ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر، مختار احمد انصاری اور خود علامہ اقبال جیسی مقتدر ہستیاں گامزن نظر آتی ہیں۔'' (خطبہ صدارت آل انڈیا کانگریس اردو ۱۹۴۴ء منعقدہ حیدر آباد، بحوالہ ''شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں'' ص ۱۵۳)

بیشک نثریات شبلی کی عظمتوں کے اعتراف میں اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ وہ سرسید کے بعد جدید اردو نثر کے مجدد اعظم کی باقیات کا ایسا ذخیرہ ہے جس پر زمانہ ہمیشہ فخر کرتا رہے گا۔

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

افسانے

معین الدین عثمانی

264,Shahu Nagar, Jalgaon 425001(Mob. 09420390562)

# حیات انسانی کا نوحہ

شارع حیات کا وہ مسافر اکیلا نہ تھا۔ اس کے ساتھ ایک جم غفیر تھا، اس کے باوجود بھی اسے معلوم نہیں کیوں یہ احساس تھا کہ وہ اس بھیڑ میں اکیلا ہے۔ اس احساس نے اسے کب آگھیرا تھا، اس کا بھی اسے علم نہ تھا، وہ تو بس اپنی رو میں آگے بڑھ رہا تھا۔

بہت دیر چلتے چلتے جب وہ تھک گیا تو ستانے کی غرض سے اس نے اپنے قدم روک لیے اور پلٹ کر دیکھنے لگا۔ اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی اور پھر اسے مایوسی بھی ہوئی، کیونکہ اس کا سفر بہت ہی کم فاصلے پر محیط تھا اور منزل کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ وہ سوچنے لگا، کیا اس عرصہ میں وہ یوں ہی بھٹکتا رہا۔

''نہیں، ہرگز نہیں۔'' دل کو تسلی دینے کے لئے اس نے اپنے آپ سے حامی بھری۔

تبھی اچانک ماضی کے ایک ایک منظر اس کی نگاہوں کے سامنے رقص کرنے لگے۔ ایک تصویر نظروں کے سامنے آتی اور پوری طرح اُبھر بھی نہ پاتی اور دھند میں کہیں کھو جاتی۔ وہ سانسوں کو روکے ان ڈوبتے، اُبھرتے مناظر کو روک کر دیکھنا چاہتا تھا، مگر کوئی بھی منظر ٹھہر نہیں پا رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیسے وہ مناظر کو اپنی آنکھوں کی قید میں لائے۔

اس نے یکبارگی اپنے اطراف میں دیکھا۔ وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ جب اسے اپنے تنہا ہونے پر یقین ہو گیا تو ایک قسم کی فاتحانہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر رینگ گئی۔ اسے لگا شاید اب وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گا اور پھر چند لمحوں بعد ایسا ہوا بھی۔

ذہن کے دریچے سے نکل کر آنکھوں کے راستے اُبھرنے والی ایک تصویر کو قابو میں کرنے میں اس کی جدوجہد رنگ لائی۔

شاید وہ کسی گاؤں کا منظر تھا۔ جہاں اپنے بچپن کے حدود میں وہ کلانچ بھر رہا تھا۔ پہاڑوں کی اوٹ سے سورج دھیرے دھیرے اُبھر رہا تھا۔ اس کی سنہری کرنیں درختوں کے پتوں پر سونا بکھیر رہی تھیں۔ بادِ سحر کے جھونکے ہلکے ہلکے تھپیڑوں کے ساتھ اس کے نرم گداز جسم کو گدگدا کر آگے بڑھ رہے تھے۔ اس نے رات کی بچی ہوئی روٹی بکری کے تازہ دودھ میں ڈبو کر کھائی، پھر اچھلتے کودتے اپنے ہمجولیوں کے ساتھ درختوں اور ندی کنارے پھیلی ریت کے میدان میں یہاں سے وہاں دوڑتا رہا۔ تبھی اچانک اس کی نظر اپنے چھوٹے لڑکے پر چلی گئی۔

کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا وہ اسکرین پر نظریں جمائے معلوم نہیں کیا دیکھ رہا تھا۔ قریب کی میز پر دودھ سے بھرا گلاس اور بریڈ سلائزاے سی کی ٹھنڈک سے یخ بستہ ہوئے جا رہے تھے۔

کمپیوٹر کی دنیا میں جادو بھرا منظر تھا۔ لڑکے کی انگلیاں کی بورڈ کے بٹنوں پر اِدھر سے اُدھر گھوم رہی تھیں۔ اسکرین پر اُبھرتے مناظر اس کے چہرے پر ایک الگ ہی دنیا کے تاثرات سجا رہے تھے۔ وہ سوچنے لگا۔ شاید وہ کوئی ہارر فلم دیکھ رہا ہے، مگر دوسرے ہی پل، اسکرین پر ابھرتے ادھ کھلے بدن کچھ اور ہی داستان بیان کر گئے۔ یہ سب دیکھ کر اس کے بدن میں جھرجھری سی آ گئی۔ یکبارگی اس نے اسکرین سے نظریں چرانے کی کوشش کیں اور من ہی من میں بدبدانے لگا، مگر کمپیوٹر کی آواز میں اسے اپنی آواز میلوں دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اِدھر لڑکے کی محویت اپنی جگہ برقرار تھی۔ مناظر اسی طرح یکے بعد دیگرے اپنی ہیئت بدل رہے تھے اور وہ اپنی جگہ آنکھوں پر ہاتھوں کا چھجا بنائے دوسری جانب دیکھ رہا تھا۔ تبھی اسے اپنی جوانی کا منظر دکھائی دیا۔

سفید پالین کی قمیص اور پائجامہ اس کا من پسند پہراوا

PDF Compressor Free Version



تھا اور طبیعت کی نفاست اسے ہر دم صفائی پر اکساتی تھی۔ وہ کہیں بیٹھتا بھی تو پہلے جگہ کی صفائی کا خیال کرتا۔ اس دوران کپڑوں کو یوں سمیٹے رہتا، مانو اطراف کی گندگی کسی بھی پل یلغار کر دے گی۔ نظروں کے زاویے ہمیشہ زمین کی جانب جھکے ہوئے۔ مخاطب کو لگتا کہ وہ زمین پر کسی چیز کا متلاشی ہے۔ حالت سفر میں بھی وہ اندرون سواری کھویا رہتا، جب کہ دیگر مسافر سامنے کے مناظر میں ڈوبے رہتے۔

اچانک بریک کی چرچراہٹ سے اسکرین کا بٹن خود بخود دب گیا اور منظر بدل گیا۔

اس کے سامنے والی سیٹ پر بیٹھی خاتون نے انگڑائی لے کر کھڑکی کے باہر کے منظر کو اپنی آنکھوں کے کیمرے میں قید کر کے اس کی طرف چند فقرے اچھالے۔ جواب تو درکنار اس نے نظریں اٹھانے کی زحمت بھی نہ کی۔ ممکن ہے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو، مگر یہ کیسے ممکن تھا۔ وہ تو اس کے بہت قریب تھا۔ دوران سفر ویسے بھی دوریاں کم ہو جاتی ہیں، فاصلے سمٹ جاتے ہیں۔ اے سی کمپارٹمنٹ میں وہ تنہا سفر کر رہی تھی۔ اس کے نڈر پن پر حیرت ہوئی۔ وہ سوچنے لگا، دنیا بدل گئی ہے۔ عورت مرد کی تفریق ختم ہو گئی ہے۔ وہ بہ آسانی دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک آ جا سکتی ہے۔ اسے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ وہ سوچ رہا تھا اور سوچ کے صفحات پر گزشتہ دنوں کی خبریں گشت کر رہی تھیں۔ ریپ کیس، چوری، ڈکیتی کی سرخیاں جھلک دکھلا کر غائب ہو رہی تھیں۔

اس نے ذہن پر دباؤ ڈال کر سوچا تو معلوم ہوا، عورت کو تو قدرت نے صنف نازک کا درجہ دیا ہے۔ اسے تو مرد کی ماتحتی میں سکون اور آرام بخشا گیا ہے، پھر آج کا یہ مساوات مرد و زن کا فلسفہ؟ اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا، شاید کسی کے پاس بھی نہ تھا۔

سفر کی تھکان سے بدن چور تھا۔ کسی طرح وہ بہ عجلت گھر پہونچ جانا چاہتا تھا۔ ایک مقام سے دوسرے مقام کا سفر گھنٹوں میں طے کیا جاتا ہے، مگر اسٹیشن سے گھر تک کی دوری طے کرنے میں اسے زمانہ لگ گیا۔ شاید وہ ایک طویل عرصہ سے یوں ہی چل رہا تھا۔

اسٹیشن سے باہر آیا تو وہاں آٹو رکشہ والے قطار میں کھڑے اپنی باری کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ مسافروں کو آواز دے کر رجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ کرایے کا تعین ہو جانے پر کچھ مسافر روانہ ہو رہے تھے تو کچھ معاملہ طے نہ ہونے کی بنا پر سامان اٹھائے آگے بڑھ رہے تھے۔ اس نے بھی اپنی اٹیچی کو سنبھالتے ہوئے کرایہ طے کرنے کی کوشش کی تھی، مگر سواریوں کی بھیڑ میں اس کی آواز کہیں گم ہو گئی تھی اور پھر وہ پیدل ہی چل پڑا تھا۔ بدن پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ حالانکہ اس نے اسٹیشن کے آنے سے قبل گھر پر لڑکے کو فون کر دیا تھا کہ وہ اسٹیشن پر اسے لینے کے لئے بائیک لے کر آ جائے۔ لڑکے نے حامی بھی بھری تھی، لیکن کافی انتظار کے بعد بھی وہ نہیں آیا تھا اور نہ ہی فون پر رابطہ قائم کیا تھا۔ ادھر کرایے کی زیادتی کے سبب اس نے آٹو رکشہ کے خیال کو جھٹک دیا تھا اور پیدل ہی چل پڑا تھا۔

وہ ایک عرصہ سے شہر کی سڑک پر سامان اٹھائے پیدل جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ یادوں کا ایک طویل سلسلہ تھا جو ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف رنگ برنگی برقی قمقموں کی جگمگاہٹ سے روشنی تھی۔ رات ہونے کے باوجود بھی دن کا گمان ہو رہا تھا۔ دو رویہ سڑکوں کے اطراف بنے عالی شان ہوٹلوں کے مناظر آئینے کی طرح صاف نظر آ رہے تھے۔ کوئی خوش گپیوں میں، تو کوئی کھانے میں مشغول تھا، تو کوئی شراب سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

اسے خیال آیا پہلے تو گھر سے باہر کھانا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اور سڑکوں پر کھانا تو شرفا کے چلن کے خلاف ہے۔ شراب و شباب کے شوقین بھی چوری چھپے یہ شغل کرتے تھے، مگر اب کیا ہو گیا کہ کھلے عام یہ موج مستیاں جاری ہیں۔

سڑک کی بھیڑ میں بھی اسے سناٹے کا احساس ہونے لگا۔ اسے لگا کہ وہ کسی قبرستان سے ہو کر گزر رہا ہے اور مردے قبروں سے نکل کر سڑکوں پر اچھل کود کر رہے ہیں۔ ایک قسم کی دہشت نے اسے آگھیرا تو اس نے اپنی رفتار بڑھا دی۔ وقفے وقفے سے پیچھے پلٹ کر دیکھنے لگا کہ کہیں کوئی اس کا تعاقب تو نہیں کر رہا ہے۔

تبھی اسے یاد آیا، والد صاحب سے اس نے کھیت میں کھانا لانے کا وعدہ کیا تھا، مگر بچوں کے ہمراہ کھیلتے ہوئے بات اس کے ذہن سے نکل گئی تھی۔ شام کو والد کی پھٹکار نے اسے ادھ مرا کر دیا تھا۔ والدہ نے

PDF Compressor Free Version



بھی صلواتیں سنوائی تھی۔ تب سے اس نے کبھی وعدہ خلافی نہ کی تھی، مگر آج جب اس کے لڑکے نے اس کا بھرم توڑا تو اسے اپنی ہی تربیت میں کمی کا احساس ہوا اور مارے گھبراہٹ میں اس نے دروازے پر لگی کال بیل دبادی۔ لڑکی نے دروازہ کھولا تو وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ اسے لگا کہ شاید وہ کہیں غلط جگہ تو نہیں آ گیا۔ لڑکی نیم عریاں بدن لیے اس کے سامنے کھڑی مسکرا کر اسے ''ہیلو'' کہہ رہی تھی۔

اس نے اپنی پیشانی کے بالوں کو جھٹکا دیا تو بیوی صوفے پر نیم دراز کی حالت میں نظر آئی۔ قدرے اطمینان کے بعد وہ اندر داخل ہوا۔ دیواروں پر اِدھر اُدھر نظریں دوڑائی تو سیمنٹ کنکریٹ سے بنا مکان اندر سے کھوکھلا محسوس ہوا، حالاں کہ یہ اس کا اپنا گھر تھا جہاں وہ برسوں سے رہ رہا تھا۔ عیش وعشرت کا تمام سامان تھا۔ پتہ نہیں کیوں اسے اجنبیت کا احساس دلا رہا تھا۔ منتخب افراد پر مشتمل اس کا یہ خاندان اس کی آمد سے بے چین نہیں ہوا تھا۔ ان کے معمولات حسب سابق جاری تھے۔ بیوی ہاتھ میں ریموٹ لئے ٹی وی پر نظریں گاڑے معلوم نہیں کیا دیکھ رہی تھی۔ لڑکا لیپ ٹاپ پر کچھ تحریر کر رہا تھا۔ لڑکی موبائیل پر کسی سے مسکرا کر محو گفتگو تھی۔ اسے لگا افراد خانہ موجود ہو کر بھی موجود نہیں ہیں۔ میرے اپنے ہو کر بھی اجنبی سے محسوس ہو رہے ہیں۔

اچانک اس کے دماغ کی بتی روشن ہوئی اور اسکرین پر گاؤں کا پرانا مکان دکھائی دیا، جس کی مٹی سے بنی دیواروں کی خوشبو مہک رہی تھی۔ امی آنگن میں بنے چولھے پر گھونگھٹ ڈالے کھانا بنا رہی تھیں۔ اچانک دادا جان گھر میں داخل ہوتے ہیں۔ دادی اماں تانبے کے لوٹے میں انہیں پانی دیتی ہیں اور پھر ان کی طرف یوں دیکھتی ہیں گویا برسوں بعد ان سے مل رہی ہیں۔ افراد خانہ کی یہ قربت اسے عجیب سی لگی تو وہ ماضی کے گھر سے نکل کر حال کے کمرے میں چلا آیا۔

دل اور دماغ میں جنگ جاری تھی۔ ماضی اور حال کی دنیا میں فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ ماضی تو گزر گیا ہے اب حال ہی میں جینا ہے۔ یہ سوچ کر طبیعت کی بے چینی رفتہ رفتہ بڑھنے لگی اور پھر پڑوس کی مسجد سے اذان کی آواز سنائی دی، حالانکہ روزانہ وہ یہ آواز دن میں کئی بار سنتا تھا، مگر کبھی توجہ نہ دے سکا تھا۔ اسے لگا کہ مؤذن آج بطور خاص اسے بلانے کے لئے ہی اذان پکار رہا ہے۔ طبیعت کی بے چینی مسجد کی طرف جانے کے لئے آمادہ کرنے لگی تو بادل نخواستہ وہ سوچنے لگا، چلو آج دوگانہ ادا کر ہی لیتے ہیں۔ یہ سوچ کر وہ مسجد کی طرف جانے کے لئے نکلا ہی تھا کہ راستے میں ایک شناسا مل گیا۔ علیک سلیک کے بعد وہ کہنے لگا:

''آج اس طرف کیسے؟''

اس نے وضاحتی انداز میں کہا: ''اذان سن کر کہاں جانا چاہیے۔ میں بھی اسی طرف جا رہا ہوں۔'' میرا جواب سن کر اسے اطمینان نہ ہوا تو وہ عجیب نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ مانو میں نے کوئی ناممکن بات کہہ دی ہو اور پھر تیز تیز قدموں سے وہ بازار کی طرف چلا گیا۔

آہستہ روی سے قدم بڑھاتے ہوئے جب وہ مسجد کے گیٹ کے قریب پہنچا تو دیکھا، دو رویوں میں بچے، بوڑھے، خواتین ہر آنے جانے والے کو آواز دے کر کچھ مانگ رہے ہیں۔ وہ سوچنے لگا، اندر جا کر اس سے مانگنے کی بجائے یہ لوگ کس کے آگے ہاتھ پھیلا رہے ہیں۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو وہ بے عجلت اندر داخل ہو گیا اور وضو کرنے بیٹھ گیا۔ اس کے پڑوس میں ایک باریش شخص پہلے ہی سے بیٹھا وضو کر رہا تھا۔ وہ وضو کر رہا تھا یا غسل وہ فیصلہ نہ کر سکا۔ کلی کرتے ہوئے زور زور سے آوازیں نکال کر تھوک رہا تھا اور ٹوٹی سے پانی آبشار کے مانند بہہ رہا تھا۔ اس کے وضو کرنے کے دوران اس قدر پانی بہہ گیا تھا کہ دس افراد بہ آسانی غسل کر سکتے تھے۔ وضو کر کے وہ جوں ہی بیت الصلاۃ میں داخل ہوا، ایک کرخت آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی:

''میری کرسی کس نے وہاں سے ہٹائی۔'' یہ کہتے ہوئے متولی صاحب مؤذن کو ڈانٹ رہے تھے۔ وہ بے چارہ گردن نیچی کئے آہستہ آہستہ کچھ بول رہا تھا۔ ادھر پہلی صف میں بیٹھے حاجی صاحب قبلہ کی طرف پیٹھ کر کے اندر آنے والوں کو غور سے دیکھ رہے تھے۔

وہ سوچنے لگا خالق کائنات کے دربار میں آنے کے باوجود بھی یہ بے توجہی؟

اسے یاد آیا حالت نماز میں ان کے بدن سے تیر نکالا گیا تھا۔ ایک کیفیت وہ بھی تھی اور آج یہ حالت ہے۔ کیا یہی اس دربار کا تقدس

(بقیہ صفحہ ۴۷ پر)

PDF Compressor Free Version

غزالہ پرویز
C-177, Block D, Shahra-e-Noor Jahan, North Nazimabad
Karachi 74700 (Pakistan)

# ملن

گھر میں ایک جشن سا سما تھا۔ ساجدہ کا لرزتا کانپتا دل اور زور زور سے دھڑکنے لگا..... وہ آ گئے..... اور فرط جذبات سے اس نے اپنی سوا تین سالہ بیٹی کو بانہوں میں بھینچ لیا اور اس کے چہرے پہ بوسوں کی بوچھار کر دی۔ ''مما چھوڑیں نا'' عروبہ بے چین ہو کر مچلنے لگی۔

''پاپا کے پاس چلیں نا۔''

ساجدہ نے آئینے میں اپنے سراپے پہ ایک تنقیدی نظر ڈالی۔ لال جوڑا، کلائیاں لال چوڑیوں سے بھری بھری، گہری لپ اسٹک، کانوں میں جھمکے، اسے خود سے ہی لاج آ گئی اور اس نے مہندی رچے ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔

اس لمحے اسے سہاگ رات میں یوں اپنا چہرہ چھپانا یاد آ گیا۔

''میں کچھ زیادہ ہی تیار تو نہیں لگ رہی ہوں۔''

اس نے اپنا سرخ تپتا چہرہ آئینے میں دیکھتے ہوئے سوچا اور فوراً ٹشو پیپر دونوں لبوں کے درمیان رکھ کر دباتے ہوئے لالی کو دھیما کیا۔ اپنے دھڑکتے دل کو سنبھالتے ہوئے، ایک گہری سانس لی اور آہستگی سے کمرے کا پردہ ہٹایا اور دروازے کی چوکھٹ سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ عروبہ اس کی ٹانگوں سے لپٹی اپنی مٹھی میں اس کی قمیص کے دامن کو زور سے پکڑے کھڑی تھی۔

فہد اماں، ابا، آپا بی، نسرین اور بچوں میں گھرا کھڑا۔ کس قدر وجیہ لگ رہا تھا، داڑھی کتنی شاندار لگ رہی تھی، وہ لا ابالی پن جا چکا تھا اور ایک بردباری سنجیدگی آ گئی تھی۔ اس نے فون پہ ٹھیک ہی کہا تھا:

''سب کہتے ہیں مجھ پہ داڑھی بہت جچتی ہے۔''

''سب کہتے ہیں۔'' وہ کس قدر الجھی تھی۔ اماں بلائیں اتارے جا رہیں تھی صدقے کے نوٹ وار وار کر۔

''چار سال کیسے گزر گئے پتہ ہی نہیں چلا۔''

اماں نے اسے لپٹاتے ہوئے کہا۔

''کیسے گزرے کوئی مجھ سے پوچھے۔'' ساجدہ کے دل نے دہائی دی اور فہد نے اماں کے کاندھے پر سر رکھے نظر اٹھائی اس کی جانب۔

ڈبک، اس کے دل نے ڈبکی لگائی اور اچانک یوں لگا اسے، جیسے ان کے درمیان صرف سلگتی سانسوں کا فاصلہ تھا۔ گرم گرم پگھلتا لاوا سی مسکراتی نظر اس کے انگ انگ میں بہہ گئی اور وہ دھک اٹھی۔

''میری عروبہ بابا کے پاس آؤ۔'' اس نے وہیں سے اپنی بانہوں کو پھیلایا اور ایک قاتلانہ مسکراہٹ سے اسے دیکھا اور ساجدہ نے اپنے نچلے ہونٹ کو دانتوں سے اتنے زور سے دبایا کی خون کا ذائقہ محسوس ہونے لگا۔

''جاؤ نا پاپا کے پاس۔''

ساجدہ نے اپنا دامن عروبہ کی مٹھی سے چھڑاتے ہوئے کہا۔

''مما.....'' عروبہ لپٹ گئی اس کی ٹانگوں سے۔

آپا بی ایک چھلانگ سے اس تک پہنچ گئیں اور ایک جھٹکے سے عروبہ کو دبوچ لیا اور اچلتی مچلتی عروبہ اپنے پاپا کے گود میں تھی۔ پورا قافلہ ڈرائنگ روم میں داخل ہو گیا اور ساجدہ یونہی چھپکلی کی مانند چوکھٹ سے چپکی رہ گئی۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور اسے احساس ہوا کہ چوکھٹ اس کے پسینے سے کس قدر شرابور ہو چکی تھی۔

وہ الٹے قدموں کمرے میں آئی اور جھپاک غسل خانے میں۔ گرم چہرے پہ ٹھنڈے پانی کے چھپاکے مارے تو منہ سے سسکاری سی نکلی۔ اس نے اپنی بے ترتیب سانسوں کو درست کرتے ہوئے آئینے میں خود کو دیکھا۔ شادی کا یہ چوتھا سال تھا۔ چند مہینے ہی شادی کو ہوئے تھے

PDF Compressor Free Version



جب فہد کے دوست نے اسے دبئی آنے کو کہا: ''وہاں کیا دکان پہ بیٹھے ہو، یہاں ٹیکسی چلانے میں کافی پیسہ ہے۔''

''فہد! یوں؟ مجھے چھوڑ کر نہ جائیں نا۔'' ساجدہ نے تقریباً اس کے کرتے کے گریبان کو کھسوٹتے ہوئے کہا۔

''پگلی کچھ عرصے کی بات ہے، آپا بی کی شادی ہو جائے بس۔''

''فہد میں آپ کے بنا نہیں رہ سکتی۔''

''وقت کا پتہ ہی نہیں چلے گا میری جان۔'' اور ایک ایک دن، ایک ایک رات گنتے گزر گئی۔ عروبہ کے آنے کی خبر ملی، عروبہ پیدا ہوئی اور وہ بڑی ہوتی گئی۔ پیسے آتے رہے جس کی وہ صرف خبر سنتی رہی۔ آپا بی کا رشتہ آ گیا، شادی ہو گئی تو ایک سال رکنے کا ابا نے کہہ دیا کہ گھر پکا ہو جائے، گاڑی خرید لی جائے، پھر ایک سال اور اماں ابا کے کمرے میں اے سی لگ جائے، ایک اور کمرہ بن جائے۔ دیور کی شادی بھی تو ہو گی اور یوں نسرین گھر آ گئی۔ اب اماں کے گھٹنے کا آپریشن ہو جائے۔ ضرورتیں شیرے کی لیس کی طرح جکڑتی گئیں اور مہینے، سال اور سال کئی سال بنتے گئے، عروبہ بڑی ہو تو گئی۔

ساجدہ کی جھلستی راتوں اور تڑپتے دنوں کا کس کو خیال تھا، بس وہ ایک موبائل تھا جو اس کی زندگی کا واحد سہارا تھا۔

''ساجدہ، ساجدہ، ارے بھئی یہ ساجدہ کہاں رہ گئی۔''

ابا کی پکار سماعت سے ٹکرائی۔ اس نے گھبرا کر اپنا حلیہ درست کیا اور ڈرائنگ روم کے دروازے پہ پہنچتے پہنچتے قدم بھاری ہو گئے۔ وہی چبھتی مسکراہٹ اس کی جانب، جیسے کہہ رہی ہو:

''کب تک دور رہو گی۔''

سبھی اس کی جانب دیکھ رہے تھے ساجدہ دوبارہ گلابی ہو گئی۔ دھیمی چال چلتے اس نے فہد کے برابر کے صوفے کی جانب قدم اٹھایا ہی تھا کہ اماں بولیں: ''ارے دلہن ادھر آ کر بیٹھو میرے پاس۔'' اور وہ سوٹ کیسوں کو پھلانگتے گرم شعلے کی آنچ کو محسوس کرتے فہد کے برابر سے گزرتی اماں کے پاس جا بیٹھی۔ تحفے بٹ رہے تھے۔ نام پکارے جا رہے تھے اور ساجدہ کبھی فہد کو چپکے سے دیکھتی، کبھی نظر جھکا کر پاؤں کے انگوٹھے سے قالین کھرچنے لگتی۔ ایک لمحے کو دل میں آیا، ایسا ہو کہ اچانک سب منظر سے غائب ہو جائیں اور بس وہ اور فہد..... یہ خیال آتے ہی کہ کوئی اس کی سوچ نہ پڑھ رہا ہو اس نے اپنے ناخن صوفے میں گھسا ہی دیے۔

عروبہ کے ہاتھ میں اس کے قد کے برابر گڑیا دیتے ہوئے فہد نے کہا:

''یہ گڑیا میری گڑیا کے لئے۔''

عروبہ تو جیسے سکتے میں آ گئی اسے تھامے۔

''بھائی یہ غلط کیا آپ نے، سبھوں کو ایک جیسا تحفہ دینا تھا۔''

''آپا بی منمنائیں کیونکہ ان کی بیٹی نے جھٹ اپنی گڑیا زمین پر پھینک دی تھی۔''

''مجھے وہ بڑی والی چاہئے۔''

''ارے واہ آپا بی، میں اپنی بیٹی سے پہلی بار مل رہا ہوں اور کچھ خاص بھی نہ دوں؟''

اس نے عروبہ کو اپنی بانہوں میں بھر کر زور سے گالوں پہ پیار کیا اور کن انکھیوں سے ساجدہ کی جانب ایک وارفتگی بھری مسکراہٹ سے دیکھا اور ساجدہ خود کو موم سا پگھلتا محسوس کرنے لگی۔

''اور بھابھی کا تحفہ کہاں ہے؟''

نسرین نے ہانک لگائی۔

''ارے وہ تو کمرے میں دیا جائے گا۔'' آپا بی کی آواز میں طنز نمایاں تھا۔ اماں نے نسرین کے سر پہ چپت رسید کی۔

''چپ کر بے شرم۔''

ساجدہ نظر اپنے ہاتھوں پہ گاڑے اپنی انگلیاں مڑوڑنے لگی۔

''چلو بھی لڑکیو! کھانے کا انتظام کرو۔''

اماں نے حکم نامہ جاری کیا اور وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

باورچی خانہ خوشبو کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

''کیا کچھ بناؤ الا میاں جی کے لئے۔''

آپا بی باورچی خانے میں داخل ہو کر دیگچیوں میں جھانکتی ہوئی بولیں۔

''کیا مہینے بھر کا کھانا آج ہی بناؤ الا؟ ایک تو حد کر دی تم نے یہ لال لال جوڑا، مہندی، کچھ تو شرم لحاظ بھی ہوتا ہے، ساس سسر بیٹھے ہیں اور بی بنو سجی سجائی۔''

ساجدہ سر جھکائے تیز ہاتھوں سے روٹیاں بیلنے لگی۔

PDF Compressor Free Version



''کیا یہ مہندی اور چوڑیوں میں روٹیاں بنیں گی۔''

''ہٹو بی بی اب دلہن بن ہی گئی ہو تو جاؤ دولہے میاں کے پاس، ہم ڈالے دیتے ہیں روٹیاں۔''

''نہیں آپا آپ میز پہ بیٹھیں۔'' ساجدہ نے آنسوؤں میں دھندلاتی ہوئی روٹی کو توے پہ ڈالا اور انگلی گرم توے کو چھو گئی۔

''نسرین میز لگاؤ جب تک۔''

اس نے اپنی آواز کو سنبھالتے اور جلن کو اپنے اندر سموتے ہوئے اپنی دیورانی کو آواز دی۔ سبھی میز پہ تھے۔

''بھئی ساجدہ کے ہاتھوں کی گرم گرم روٹیوں کا اپنا مزہ ہے۔'' ابا بولے۔ ساجدہ نے فہد کے برابر کھڑے ہو کر روٹی کپڑے میں لپیٹ کے رکھی اور فہد کا ہاتھ اس کے جسم سے چھو گیا اور کرنٹ کا جھٹکا سا لگا اسے۔ وہ گھبرا کر جلدی سے واپس پلٹی باورچی خانے میں۔

''کیا میں نے غلط کیا؟ کیا یہ میرا حق نہیں تھا اپنے شوہر کے لئے تیار ہونا؟'' آنسو تھے کہ امڈے ہی چلے آ رہے تھے۔ اس نے توے سے پھولی روٹی کو اتارا اور وہ پھٹ گئی۔ گرم بھاپ نے ہاتھ کے پشت کی مہندی کو گہرا کر دیا۔

''میں نہ پھٹی تو روٹی ہی سہی۔'' وہ دھیرے سے بڑبڑائی۔

''باجی میں نے کھالیا، باقی روٹیاں میں ڈال لوں گی..... آپ جا کر بیٹھیں۔'' نسرین نے اس کے ہاتھوں سے بیلن چھینتے ہوئے کہا اور وہ کچھ نہ بولی، بس چپ چاپ میز پر جا بیٹھی، سر جھکائے۔

آخر کار فہد پردہ ہٹاتا کمرے میں داخل ہوا۔ ساجدہ گود میں عروبہ کو لٹائے تھپک رہی تھی اور وہ مسکراتا بستر پہ آ بیٹھا، اس کے سامنے، آگے جھکا اور اس کے حنائی ہاتھوں کو تھام لیا۔ ساجدہ کے جلے ہوئے ہاتھ کی تکلیف اور اس کے لمس نے جیسے اسے لمحے بھر کو پتھر کا کر دیا۔ اسی لمحے دروازے پر زور سے دستک ہونے لگی۔ ساجدہ نے جھٹکے سے ہاتھ چھڑایا، ایک چھلانگ سے بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی اور دروازہ کھول دیا۔

''چھوٹی خالہ اپنے اہل وعیال کے ساتھ آئی ہیں۔ اماں فہد بھائی کو بلا رہی ہیں۔'' نسرین ایک سانس میں بول گئی۔

دن تھا کہ گھسٹتا جا رہا تھا، ساجدہ نے اتنا مشکل دن پہلے کبھی نہیں گزارا تھا، ایک ایک لمحہ جیسے آبلہ پا، چبھتی طنزیہ نظروں کے کانٹوں سے چھالے پھٹتے ہوئے اور لمحات گزرتے ہوئے بھی نہ گزرتے ہوئے

''صبح کرنا شام کا، لانا ہے جوئے شیر کا''

اسے یہ شعر اپنے آپ پہ مصداق آتا لگ رہا تھا۔ وقت چیونٹی کی رفتار سے گزر رہا تھا، اسے محسوس ہوا، فروری کا سب سے گرم دن آج ہی کا دن تھا۔

اس مختصر سے مکان کے ایک چھوٹے سے کمرے میں تین ماہ کی دلہن نے جیسے صدیاں بیوگی جیسے صبر وتحمل سے، شکایت کے ایک لفظ، ماتھے کی ایک شکن کے بنا کاٹ لی تھیں، خواہشات کے جھولے پہ کبھی بیٹھی ہی نہیں، گھر کے لوگ تو جیسے اس کے وجود، اس کے جذبات، اس کی ضروریات سے ہی منکر تھے۔ ان کے سامنے ان کی اپنی ضرورتیں منہ پھاڑے کھڑی تھی، لیکن آج ایک دن اس سے برداشت نہیں ہو رہا تھا، جسم کی اضطرابی کیفیت اسے بے چین و بے قرار کئے ہوئے تھی۔ ایک دبی دبی گدگدی سی..... اور جانے کیوں اسے اپنی اس کیفیت سے شرم سی محسوس ہو رہی تھی۔

اسے جھرجھری سی آ گئی، آج دو مدھ بھری آنکھوں نے اس کے سوئے جسم میں بیداریاں جگا دی تھیں اور وہ بارش کے بعد کی نکھری دھوپ میں کھلی قوس قزح بن گئی تھی، مگر ابھی بھی کتنے گھنٹے انتظار کے باقی تھے اور پھر وہ ساعت آ ہی گئی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ دوبارہ سہاگ کے سیج پہ بیٹھی منتظر دلہن تھی۔ ڈرائنگ روم سے آتے قہقہوں کی آوازیں برچھیاں بن کر اسے چبھ رہی تھیں اور وہ اپنے اندر کی آواز چھپانے کی خاطر تھوڑی بلند آواز سے لوری گانے اور عروبہ کو تھپکنے لگی۔

''دھیرے سے آ جارے'' اور اسے محسوس ہوا شاید وہ اپنے آپ کو تھپک رہی تھی، اپنے جذبات کو سلا رہی تھی۔

''ساجدہ'' انگاروں نے اسے چھوا اور وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔

''شششش عروبہ اٹھ جائے گی یار۔''

فہد نے اسے شانے سے دبا کر بستر پہ لٹا دیا اور آخرش چار سال کے آنسو کے بند اچانک ٹوٹ گئے۔ اس نے حنائی ہاتھوں سے فہد کے کرتے کو کھسوٹ لیا اور طفل معصوم کی طرح اس کے کاندھے پر سر رکھ کے بلکنے لگی۔

(بقیہ ص ۴۷ پر)

PDF Compressor Free Version

غزالہ قمر اعجاز

Flat No. 405, Haq Enclave Apartment, Aashiana, Digha Road
Raja Bazar, Samanpura, Patna 800014

# کماؤ پوت

میرے چاروں طرف اندھیرا تھا اور میں گہرائی میں گرتا جا رہا تھا۔ کوئی کنواں تھا شاید، روشنی کی کوئی کرن نظر نہیں آ رہی تھی، پتہ نہیں دن ہے یا رات، کیا کروں۔ میں چیختا ہوں، پوری قوت کے ساتھ۔ ہاتھ پیر ہوا میں چلتے ہیں، تبھی کوئی چیز تڑاخ سے گرتی ہے اور اس سے پہلے کہ میں سنبھلتا کسی نے مجھے زور سے جھنجھوڑا، پھر میرے ساتھی آصف بھائی کی آواز کانوں سے ٹکرائی:

''کیا ہوا ارشد..... اٹھو..... دیکھو گلاس گر کر ٹوٹ گیا۔''

''گلاس.....'' کمرے میں روشنی ہے اور فرش پر کانچ کے ٹکڑے بکھرے ہوئے ہیں۔ میں وحشت زدہ سا آصف بھائی کی طرف دیکھتا ہوں۔ ان کے چہرے پر بھی سوالیہ نشان ابھرتے ہیں اور پھر بے حد نرم لہجے میں وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہیں:

''کیا ہوا..... کوئی برا خواب دیکھا ہے۔''

ان کے ہاتھوں کا دباؤ میں اپنے کندھے پر محسوس کرتا ہوں اور پھر بے اختیار رونے لگتا ہوں۔

''گھر پر سب خیریت تو ہے۔''

میں ہاں میں سر ہلاتا ہوں، کیا کہتا۔

''پھر.....؟'' وہ سوالیہ نگاہ سے میرے چہرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ کچھ کہنے کے بجائے میری آنکھوں سے پھر آنسو نکلنے لگتے ہیں۔ وہ بچوں کی طرح مجھے چمکارتے ہیں، پھر پانی پلاتے ہیں تو میرے حواس کچھ درست ہوتے ہیں۔

''چائے بناؤں؟''

میں نا میں سر ہلاتا ہوں: ''صبح ہونے میں ابھی دیر ہے۔ چائے پینے سے نیند نہیں آئے گی۔''

''ہاں یہ تو ہے..... پھر تم سونے کی کوشش کرو۔''

مجھے لٹا کر وہ چادر اوڑھاتے ہیں اور پھر خود اٹھنے لگتے ہیں، مگر میں ان کا ہاتھ پکڑ کر پھر رونے لگتا ہوں۔ حیران ہو کر مجھے چپ کرانے کی کوشش کرتے ہوئے وہ میرے برابر بچی جگہ پر خود بھی لیٹ جاتے ہیں۔ میں کس کر انہیں جکڑ لیتا ہوں۔ ان کے ہاتھ خود بہ خود مجھے تھپکیاں دینے لگتے ہیں۔ پتہ نہیں وہ کب تک ایسا کرتے ہیں کیوں کہ جلد ہی نیند مجھے اپنے آغوش میں لے لیتی ہے۔ ٹوٹے ہوئے انسان کے لئے یہ جذبہ ہی بہت ہے۔

''تم دونوں اس طرح..... یہ کیا بیہودہ حرکت ہے۔''

عبدل بستر کے پاس کھڑا ہو کر اس طرح چیختا ہے کہ ہم دونوں ایک ساتھ اچھل کر بیٹھ جاتے ہیں۔ میں آنکھ ملتا ہوا عبدل کی طرف دیکھتا ہوں اور پھر آصف بھائی کو۔ کل رات کا واقعہ میری نظروں کے سامنے گھومتا ہے۔

''اب کیا ہوا۔'' آصف بھائی کچھ نہ سمجھتے ہوئے ہم دونوں کی طرف باری باری دیکھتے ہیں:

''یہ کیا ہو رہا ہے تم دونوں کے بیچ، ہوش کے ناخن لو، یہ سب کتنا غلط ہے، جو تم.....''

وہ تمتمائے چہرے کے ساتھ بے ربط سے جملے بولتا ہے۔ میں حیران ہو کر پھر ارشد کی طرف دیکھتا ہوں۔ وہ اشارے سے لاعلمی کا اظہار کرتا ہے۔ عبدل ہماری طرف پیٹھ کئے اب بھی ہمیں لعنت ملامت کر رہا ہے۔ یکا یک میری چھٹی حس بیدار ہوتی ہے اور مجھے احساس ہوتا ہے کہ عبدل کا یہ تیور ہم دونوں کو ایک ساتھ ایک چھوٹے سے تخت پر غیر فطری انداز سے سوتا ہوا دیکھ کر بدلا ہے۔ شاید وہ اپنی جگہ ٹھیک بھی

PDF Compressor Free Version



ہے کیونکہ رات کے واقعے سے وہ بے خبر ہے۔ لنگی ٹھیک کرتے ہوئے میں کرتا پہنتا ہوں۔

''وہ عبدل بھائی رات ارشد.....''

''یہ سب کرنا تھا تو کم از کم دروازہ تو بند کر لیتے۔''

''آپ غلط سمجھ رہے ہیں دراصل رات میں.....''

''میں غلط سمجھ رہا ہوں۔ تم لوگوں کو اس طرح ایک تخت پر دیکھنے کے بعد۔''

وہ کچھ بھی سننے سمجھنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ ارشد چادر اوڑھے شاید سو رہا تھا یا پھر سونے کی ایکٹنگ کر رہا تھا۔ میں نے فی الحال اسے اس کے حال پر چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور عبدل بھائی کو سمجھانے کی کوشش کی، مگر وہ بدستور ہمیں کوستے رہے اور پھر باہر نکل گئے۔

میں ارشد کے بارے میں سوچتا ہوا بہت دور ماضی میں پہنچ جاتا ہوں اور کل کی اس کی حالت کا تجزیہ اپنے گزرے ہوئے وقت سے کرنے لگتا ہوں، جس نے اسے اتنا بے بس کر دیا کہ وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ تقریباً بیس سال پہلے کی بات ہے۔ اس وقت میری عمر بھی بیس سال کے قریب ہی تھی۔ ہم آٹھ بہن بھائی تھے۔ مجھ سے بڑی ایک بہن تھی اور سب سے چھوٹا بھائی چار سال کا تھا جو ابھی تک صرف گھسک کر چلتا تھا اور ناک اس کے ہونٹوں سے ہوتی ہوئی ٹھوڑی کے نیچے بہتی رہتی۔ ہم غریب ہیں اور بہت غریب۔ یہ احساس مجھے شدت سے تھا اور اسی احساس کے چلتے میں نے اپنی پڑھائی لکھائی پتہ نہیں کب سے چھوڑ کر ابا کی سائیکل کی دوکان میں پنکچر جوڑنے کے بجائے امیر بننے کے سپنے دیکھتا رہتا، مگر سب فضول۔ انوار بھائی ہمیشہ ہماری دوکان سے پنکچر جڑواتے اور پھر دھیرے دھیرے میرے رازدار بھی بن گئے۔

''عرب جاؤ گے کام کرنے.....؟''

پتہ نہیں وہ کون سی صبح تھی جب انہوں نے مجھ سے سیدھا سوال کیا اور میں ان کے پیروں میں گر گیا۔ سائیکل کی دوکان سے سیدھا ہوائی جہاز اور چھوٹے سے قصبے سے عرب جیسا ملک۔ میرے پسینے چھوٹ گئے۔ انوار بھائی مجھے اس وقت کسی فرشتے کی طرح معلوم ہوئے، جن کے ہاتھوں میں میری قسمت کی کنجی آ گئی ہو۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ان کا چھوٹا بھائی جہاں کام کرتا ہے، وہ لوگ سعودی عرب میں تجارت کرتے ہیں اور وہاں انہیں کچھ ایماندار اور محنتی لڑکوں کی ضرورت ہے۔ میں نے اس سے تمہارا ذکر کیا ہے۔ تمہیں جانے کے خرچ کے لئے پیسوں کا انتظام خود کرنا ہوگا۔ باقی کام وہ اپنے ایجنٹ سے کروالیں گے۔ کل تم تیار ہو کر آ جاؤ، میں تمہیں ان سے ملوا دیتا ہوں۔

میں نے ہاں میں سر ہلایا۔ اسی لمحے مجھے اپنے اندر ایک عجیب سی تبدیلی کا احساس ہوا۔ میں نے کپڑوں کو رگڑ رگڑ کر دھویا اور صابن لگا کے دیر تک نہاتا رہا۔

دوسرے دن انوار بھائی کی بتائی جگہ پر وقت سے پہلے ہی تیار ہو کر آ گیا۔ صاحب نے اوپر سے نیچے تک مجھے دیکھا، کچھ سوال کئے اور پھر مطمئن ہو کر مجھے اپنی کمپنی میں پندرہ ہزار روپے ماہوار اور کھانے اور رہنے کی سہولت کے ساتھ رکھ لیا۔

ٹکٹ اور ویزے کے لئے تیس ہزار روپے ایجنٹ کو دینے تھے۔ ہامی تو میں نے بھر لی، مگر یکمشت تیس ہزار جمع کرنا مشکل کھیر ثابت ہوا۔ اماں نے اپنی تمام جمع پونجی نکالی، کچھ زیور تھے، وہ گروی رکھے، بے حد مشکل سے اٹھارہ ہزار کا انتظام ہو سکا۔ بچے بارہ ہزار، کچھ مدد انوار بھائی نے کی اور کچھ ابا نے قرض لیا اور تیس ہزار جمع ہو سکے۔ کاغذی کارروائی اور بھاگ دوڑ میں پانچ ہزار اور خرچ ہوئے۔ ویزہ لگا اور ٹکٹ کی بکنگ ہو گئی پہلی بار وطن اور اپنوں کو چھوڑ کر جانے کا دکھ تو تھا، مگر دوسری جانب ایک بہتر مستقبل کی خوشی نے اس غم کو ہلکا کر دیا۔

چار گھنٹے کی فلائٹ پیچھے چھوٹی یادوں اور باتوں کو تازہ کرتی رہی اور میں عرب کی مقدس سرزمین پر اپنی اور خاندان کی بھلائی کا خواب سجائے اپنے کام میں لگ گیا۔ پہلی تنخواہ ہاتھ میں آئی تو جیسے یقین ہی نہیں ہوا، ایک مہینے کی اتنی تنخواہ، پیسے گھر پہونچے تو سب میرے جانے کے غم سے آزاد ہو گئے، مگر کچھ ہی مہینوں میں احساس ہو گیا کہ ضرورتوں کی لمبی فہرست کے آگے وہ کافی سے بے حد کم ہیں۔ قرض کی ادائیگی، گھر کی ٹپکتی چھت کی مرمت اور دوکان میری ترجیحات میں شامل تھے۔ اس کے علاوہ گھر کے نو افراد کی ضرورتیں، دوا علاج۔ میں پیسے

PDF Compressor Free Version



بھیجتا اور اماں فون پر اخراجات کی تفصیل بیان کرتیں۔

دو سال گزر گئے۔ میں گھر آیا۔ چھوٹے بھائی ساجد کے لئے گھڑی خریدی تھی، مگر اسے موبائل کی توقع تھی۔ راشد کو جیکٹ کی خواہش تھی اور میں اس کے لئے ٹی شرٹ لے گیا تھا۔ بہن کو کانوں کے جھمکے کی امید تھی اور میں اس کے لئے میک اپ کٹ لے گیا تھا۔ میں سب کو تحفے دیتا رہا اور سب کے منھ گرتے گئے۔ اماں کے لئے کمبل لے گیا تھا۔ پہلے والا کمبل بہت پرانا ہو گیا تھا اور پھٹ بھی چکا تھا۔ وہ بہت دیر تک اس پر ہاتھ پھیرتی رہیں اور پھر ریحانہ کے لئے اسے رکھ دیا اور گیلی آنکھوں سے مجھے دعائیں دینے لگیں۔

دیکھتے دیکھتے ایک مہینہ گزر گیا۔ میں واپس اسی اجنبی جگہ پر اپنوں کی خوشیوں کی تلاش میں آ گیا۔ اماں کو ریحانہ کے رشتے کی فکر تھی۔ کئی رشتے سامنے تھے۔ میں نے تاکید کی کہ جلد ہی اس فرض کے ادا ہونے کی کوشش کریں۔ اس کے بعد نجمہ اور شازیہ کا مسئلہ تھا۔ ساجد نے پڑھائی چھوڑ دی اس کا اصرار تھا کہ ابا کی سائیکل کی دوکان کی جگہ موٹر پارٹس کا کاروبار شروع کیا جائے۔ گھر بھی کافی پرانا اور مخدوش ہو چکا تھا۔ میں ڈائری لئے حساب کتاب جوڑتا رہتا۔ ریحانہ کا رشتہ طے ہو گیا۔ ان لوگوں نے شادی جلد کرنے کا اصرار کیا۔ میرا جانا ممکن نہیں تھا میں نے پیسوں کا بندوبست کیا اور اماں سے کہا کہ ہمارے گھر کی پہلی شادی ہے، کچھ کمی نہ ہونے پائے اور ہر کام بخیر خوبی انجام بھی پا گیا۔ اماں خوش تھیں، بیٹی اچھے گھر بیاہ کر گئی تھی۔

شادی سے فراغت کے بعد میں نے گھر کی مرمت کا پروگرام بنایا۔ اماں کا خیال تھا کہ چھت پر ایک کمرہ بن جائے۔ تمہاری شادی کے وقت ضرورت پڑے گی۔

شادی، دل میں عجیب سی گدگدی ہوئی۔ میں نے اور ٹائم شروع کر دیا تا کہ کچھ اور پیسوں کا انتظام جلد ہو جائے۔ کمرہ بن گیا۔ پتائی ہونی تھی۔ اماں نے رنگ پوچھا تھا۔ سفید رنگ ماحول کو اداس کر دیتا ہے۔ مجھے ایک دم خیال آیا، نیلا، جذبات کو سرد کر دیتا ہے۔ ہرا ٹھیک ہے۔ آنکھوں کو سکون دیتا ہے، مگر میں نے گلابی رنگ منتخب کیا، جذبات میں گرمی بھر دیتا ہے۔ گلابی کمرے میں سرخ پھولوں کی سیج پر لال کپڑوں میں سمٹی سمٹائی دلہن کا تصور ہی ہیجان پیدا کر دیتا ہے۔ یہی ٹھیک ہے۔ میں نے گلابی رنگ سے کمرہ پینٹ کرنے کو کہا اور اپنی خالی زندگی میں رنگ بھرنے لگا۔

کئی سال گزر چکے تھے۔ میں ستائیس سال کا ہو چکا تھا۔ اماں نے بڑی چچی کی کسی رشتے دار کا ذکر کیا تھا۔ لڑکی خوش شکل، پڑھی لکھی اور سمجھ دار تھی۔ اماں نے حسنہ کی تصویر بھی بھیجی۔ لڑکی مجھے اچھی لگی۔ شاید اس لئے بھی کہ اس سے پہلے میں نے اپنی زندگی میں کسی جیتی جاگتی لڑکی کا تصور ہی نہیں کیا تھا۔ اب یہ فوٹو میرے سامنے تھی جو مجھ سے بہت کچھ کہہ رہی تھی اور میرا حال دل سننے کے لئے بیقرار بھی تھی، میں خواہ مخواہ شرما رہا تھا۔ بالکل ایسے جیسے پرانے زمانے کی ہیروئن شادی کے ذکر پر شرماتی تھی۔ مجھے ہنسی آئی اور اب میں اکثر ہنسنے لگا تھا۔ تصور میں حسنہ سے باتیں کرتا اور سوتے جاگتے رات کیسے گزر جاتی پتہ ہی نہیں چلتا تھا۔ دوستوں نے بھی اندازہ لگا لیا۔ وہ میرا مذاق اڑاتے اور میری کھینچائی بھی کرتے۔ مجھے یہ سب اچھا لگتا۔ شاید برا لفظ میری زندگی سے نکل چکا تھا۔ برا دور، برے حالات اور بری زندگی، اب شاید بہت کچھ یا سب کچھ اچھا ہونے والا تھا۔

اماں نے فون پر بتایا کہ نجمہ کے لئے ایک رشتہ آیا ہے۔ سب لوگوں کا خیال ہے کہ اس کی شادی پہلے کر دینی چاہیے اور ہو سکے تو شازیہ کی بھی ساتھ ہو جائے وہ بیس کی ہونے والی ہے۔ لڑکیوں کی عمر نکل جائے تو بہت سی مشکلیں آتی ہیں۔ ہاں یہ ٹھیک ہے۔ میں نے بھی ہامی بھری۔ پتہ نہیں کیوں میں نے اپنے خواب دیکھنے شروع کر دیے۔ چھان بین کے بعد نجمہ کا رشتہ طے ہو گیا اور شازیہ کے لئے لڑکے کی تلاش شروع ہوئی۔ کچھ دن بعد ہی نجمہ کی سسرال والوں نے شادی کا تقاضہ شروع کر دیا اور اس کی شادی کرنی پڑی۔ مجھے چھٹی نہیں مل سکی، مگر سب کام خوش اسلوبی سے نپٹ گیا اور یہ بھی بہت اچھا ہوا کہ نجمہ کی شادی میں اس کی ایک سسرالی رشتہ دار نے شازیہ کو پسند کر لیا۔ اماں بے حد خوش تھیں۔ فون پر انہوں نے کہا:

''اب سوچتی ہوں شازیہ کے ساتھ ہی ساجد کی بھی شادی کر دوں ورنہ گھر کا کام کاج کیسے ہوگا۔'' وہ روانی میں آگے کا پروگرام

PDF Compressor Free Version



بتاتی رہیں۔شازیہ اور ساجد، سال بھر میں دو اور شادیاں، اتنا خرچ، میں نے حسنہ کی تصویر دیکھتے ہوئے ڈائری پر حساب کتاب لکھنا شروع کر دیا۔

وقت تو وقت ہے گزرتا ہی رہتا ہے۔اماں تیاری کی تفصیل بتاتیں، میں پیسے کا انتظام کرتا اور وہ دن آ گیا جب میں شادی میں شرکت کے لئے گھر آ گیا۔

اس بار میں پانچ سال بعد لوٹا تھا۔سب کچھ بے حد نیا نیا اور خوشگوار لگ رہا تھا۔ریحانہ اور نجمہ شادی کی تیاریوں میں مشغول تھیں۔ میرے سامنے یہ پہلی شادی ہو رہی تھی، اس لئے ہر چیز کی ذمہ داری بھی میری تھی۔دو دن بعد شازیہ اس گھر سے رخصت ہو جائے گی اور ساجد کا گھر بھی بس جائے گا۔سب لوگ میری تعریف کر رہے تھے اور مجھ جیسے سعادت مند بیٹے پر عش عش کر رہے تھے۔میں بھی خوش تھا۔ہر کام نپٹ جائے تو اماں سے کہوں گا کہ وہ میرا رشتہ بھی طے کر دیں۔میں سال بھر کے اندر آنے کی کوشش کروں گا۔ولیمے سے فرصت پا کر میں کمرے میں جا رہا تھا کہ چھوٹی چچی کو کسی سے کہتے سنا:

''آج آصف کا بھی نکاح ہو جاتا تو کتنا اچھا ہوتا۔حسنہ کے گھر والوں نے اتنا اصرار کیا، وہ تو انتظار کرنے کو بھی تیار تھے، مگر ان لوگوں نے پہلے تو کوئی جواب نہیں دیا، پھر انکار کر دیا۔اب بھلا کماؤ پوت کو کوئی آسانی سے چھوڑتا ہے۔''

''کماؤ پوت''، میرے دل کو ایک دھچکا لگا۔بغیر کسی شور کے بغیر کسی دھماکے کے بہت کچھ ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گیا۔کسی نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا، کوئی کچھ نہیں بولا۔ویلٹ سے حسنہ کی فوٹو نکال کر میں نے ٹکڑے ٹکڑے کیا اور ہوا میں اچھال دیا، بالکل ایسے ہی جیسے کچھ لمحے پہلے میرا دل چور چور ہوا تھا۔

میرے جانے کا وقت آ گیا تھا۔میں بھاری دل اور بوجھ کے ساتھ واپس لوٹ آیا۔کمرے کے اسی تخت پر لیٹے ہوئے میں حسنہ کا تصور دل میں بسائے آگے کے پروگرام بنایا کرتا تھا اور وہ مجھے خوابوں میں آ آ کر گدگدایا کرتی تھی۔ہر کروٹ پر میں اس سے قریب اور قریب ہو جایا کرتا تھا، مگر اب اسی بستر پر مجھے کانٹے سے چبھتے محسوس ہوتے۔ کسی مشین کی طرح میں چلتا رہتا دل تو زخمی ہو چکا تھا، صرف میرا وجود تھا جسے میں گھسیٹ کر زندہ رکھ رہا تھا۔

دوست میرے آگے کے پلان کے بارے میں سوال کرتے، میں اپنی مرضی کے مطابق انہیں جواب دے دیتا، مگر کب تک، میں نے اس جگہ کو چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور اتفاق سے مجھے دوبئی کی ایک کمپنی میں کام مل گیا۔یہاں کی تیز رفتار زندگی میں میرا دکھ پیچھے رہ گیا اور میں دھیرے دھیرے نارمل ہونے لگا۔

ابا کو دمہ نے جکڑ لیا تھا اور وہ مستقل بستر پر آ گئے۔ساجد نے الگ گھر بسا لیا۔راشد کے پاس کوئی کام نہیں تھا اور وہ سارا دن آوارہ گردی کرتا رہتا۔چھوٹا بھائی بھی اس کی روش پر چل رہا تھا۔اماں کے لہجے میں دوبارہ وہی بے بسی کی جھلک لوٹ آئی تھی۔منیہ پڑھائی پوری کر کے گھر میں بیٹھ چکی تھی اور سارے مسئلوں کا حل مجھ پر آ کر ٹک جاتا۔

''کماؤ پوت'' میرے کانوں میں کوئی سرگوشی کرتا، پھر آواز تیز ہوتی اور پھر اتنی تیز کہ مجھے آس پاس کی کوئی بات سنائی نہیں پڑتی۔ میں شاید بہرا ہو گیا ہوں۔میں دوسری آواز سننے کی کوشش کرتا اور پھر ایسے ہی کسی خطرے کی آگاہی میں میں زور سے چیخ پڑتا۔

تنہائی کا خوف مجھے سونے نہیں دیتا تھا اور صبح کے انتظار میں میں ٹہلتے ہوئے رات گزار دیتا۔کمرے میں رہنے والے میرے ساتھی آتے جاتے رہے، مگر مجھے تو یہیں رہنا ہے، میں اپنے دل کو سمجھاتا۔

ارشد کمرے میں نیا نیا آیا تھا۔بے حد خوش اخلاق اور ہنسنے ہنسانے والا بندہ تھا۔خالی وقت میں وہ اپنے بارے میں بتایا کرتا۔اس کے گھریلو حالات بھی کچھ اچھے نہیں تھے، مگر اسے امید تھی کہ جلد ہی سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔میں اسے ہمت بندھاتا، وہ میری دلجوئی کرتا۔

ساتھ رہتے ہوئے کئی سال سرک گئے۔اچانک اس کے اندر میں نے تبدیلی محسوس کی۔اکیلے میں وہ مسکراتا اور گھنٹوں کھڑکی میں کھڑا ہو کر آسمان کی طرف دیکھتا رہتا۔میرے کچھ پوچھنے پر وہ جھینپ جاتا۔میں ہنس کر خاموش ہو جاتا۔وہ مجھ سے کافی چھوٹا ہے یہ لحاظ بھی تھا۔میرے دل سے اس کے لئے دعا نکلتی، مگر اس رات اس کی بے بسی نے میرے تمام زخم تازہ کر دیے اس کی کیفیت بتا رہی تھی کہ حالات نے

(بقیہ ص ۷۲ پر)

PDF Compressor Free Version



انور نزہت

"Kashana" H-1, Muradi Road, Batla House, Jamia Nagar, New Delhi 110025

# بدلتے رشتے

وہ فہمیدہ کا چھپر کھٹ نہیں سجا رہی تھی بلکہ اپنے مزار پر پھول چڑھا رہی تھی۔ اسی وقت لمبا سا ہار پہنے فرمان سامنے سے نمودار ہوا۔ وہ اسے دیکھ کر لرز گئی۔ تھوڑی دیر کے لئے اس کے دل نے کہا، یہ جو انسانیت کا لبادہ پہن رکھا ہے اسے چاک کر دے اور فرمان کو اپنے بازوؤں میں چھپا کر یہاں سے کہیں دور لے جائے۔ اب فرمان اور اس میں دو قدم کا فاصلہ رہ گیا ہے جو بڑھتے بڑھتے سانپ بن جانے والا ہے۔ ہاتھ میں پکڑے ہوئے پھول اسے بچھوؤں کی صورت میں ڈسنے لگے۔

کل کی اس کی آخری رات تھی جو اس نے فرمان کے زانو پر سر رکھ کر بتائی تھی۔ ساری شب وہ فرمان کے زانو پر سر رکھ کر فرمان کے چہرے پر اپنی زلفیں پھیرتی رہی تھی اور وہ بھی مسلسل قسمیں کھاتا رہا تھا اپنی ثابت قدمی اور وفا شعاری کی، وہ ہر بار ہنس پڑتی۔ کیسے یقین ہو کہ پیار کئے دیتے ہو؟

اس کے لئے کل کی شب بڑی پر سوز تھی وہ دل مسوس کر رہ جاتی تھی، لیکن آج وہ نیند کی گولیاں خرید کر لے آئی تھی۔ آج وہ لمبی نیند سو جانا چاہتی تھی آج اس کا مسیحا اور پیار کرنے والا شوہر اس کی سوتن کے ساتھ شب بسر کرے گا اور وہ انگاروں پر لوٹ رہی ہوگی۔

بی اماں لال جوڑا پہنے نمودار ہوئیں۔ اس کو وہ بارات میں ساتھ لے جانا چاہتی تھیں، ان کو یہ بھی ڈر تھا کہ ریشما کو اگر گھر میں چھوڑ گئیں تو یہ عروسی چھپر کھٹ میں کوئی نامرادی کا ٹوٹکا نہ کر دے۔ وہ بارات کے ساتھ جانا نہیں چاہتی تھی، مگر اس کو جانا پڑا، یوں جیسے کوئی اپنے جنازے کے ساتھ چل رہا ہو۔ کچھ لوگوں کی عادت ہوتی ہے ہمدردی نہیں کرتے ہمدردی کے بہانے زبان کا چھرا گھونپ کر تڑپنے کا تماشہ دیکھتے ہیں، اسی لئے تو وہ ایسا لئے سیدھے سوال کرنے سے باز نہیں آتے:

''یہ ہے پہلی بیوی۔''

''ہائے کتنی خوبصورت اور پیاری بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی رچا رہا ہے۔'' دوسری نے کہا:

''اپنے اپنے نصیب کی بات ہے بے چاری کے یہاں بچہ نہیں ہوا، ہائے کتنی بدنصیب ہے بے چاری۔'' ایک بولی:

''واہ میرے مولیٰ تیرے صدقے، کتنے دل گردے کی بات ہے جو اپنے شوہر کی بارات لے کر آئی ہے اور کس طرح ہنس ہنس کر سب کو بری دکھا رہی ہے۔ فہمیدہ تو اس کے پاؤں کے برابر بھی نہیں ہے، لیکن جس کو پیا چاہے وہی سہاگن۔''

وہ اس طرح کی باتیں سن سن کر مسکرائے جا رہی ہے وہ اور کر بھی کیا سکتی تھی۔ جبر کرتے کرتے دل پھوڑا بن گیا تھا۔ بارات گھر آ گئی تھی اور وہ چپکے سے اوپر آ گئی اور اس کے دل میں ایک شور سا اٹھا کہ دروازہ کھلا اور فرمان اندر چلا گیا۔ اسے اپنی وہ خوبصورت شب عروسی یاد آنے لگی اور مرد کی بے حسی۔ کچھ ہی دیر میں فرمان کندھوں پر پھول لٹکائے کمرے سے باہر آیا اور اس کی سانسیں بھی بے ترتیب ہو رہی تھیں۔ اماں بی بھی ڈرتی کانپتی کھڑی ہو گئیں اور ان کے ساتھ چند عورتیں بھی۔ یہ دیکھ کر ریشما ڈر گئی اور سوچنے لگی اب اور کون سی قیامت آنا باقی ہے۔ اماں بی کی آواز آئی: ''بیٹا بولو کیا بات ہے۔''

فرمان کی بھاری آواز گونجی:

''ریشما میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔''

''نہیں فرمان..... نہیں تم ایسا نہیں کر سکتے تم اپنے الفاظ واپس لو آخر میرا قصور کیا ہے۔ نہ تم میرے بغیر جی سکو گے اور نہ میں تمہارے بغیر۔'' پھر اس کی آواز گونجی:

PDF Compressor Free Version



''میں آپ سب کی موجودگی میں ریشما کو طلاق دیتا ہوں۔''

وہ تین بار کہہ کر چلا گیا۔ اماں بی ریشما کو بازو سے پکڑ کر باہر لے گئیں، لیکن اس کی چیخیں تھیں کہ دل کو لرزا رہی تھیں۔ آخر یہ ہدایت بھی فہمیدہ کو اماں بی کی طرف سے ہی تھی کہ جیسے ہی تمہارے پاس فرمان آئے اور مطالبہ کرے تم پیچھے ہٹ جانا اور اس سے ریشما کو طلاق کا مطالبہ کر دینا۔ دیکھو طلاق دلوائے بغیر اسے اپنا شوہر نہ بننے دینا، چاہے تمہیں کتنی ہی راتیں غارت کرنا پڑیں، ورنہ اس کے بغیر تم فرمان کو اپنا نہ بنا پاؤ گی اور تم دوسری بیوی ہی رہو گی۔''

ریشما فرمان سے بے انتہا محبت کرتی تھی۔ یہ اس کی محبت ہی تھی جو دوسری شادی کی اجازت ہی نہیں دی، خود شریک ہو کر اس کو بیاہ کر لائی۔ اس کو اس بات کا بھی غم تھا کہ اس کو طلاق ہو گئی۔ وہ کس کس کو اپنی صفائی دے گی۔ اس نے نیند کی گولیاں کھا کر خود کو بے ہوش رکھا اور اماں بی نے نئے دولہا دلہن کے اٹھنے سے پہلے اس کو میکے پہنچا دیا یہ کہہ کر کہ سامان بعد میں پہنچ جائے گا۔

فرمان نے شادی تو کر لی، لیکن اسے زندگی کا کوئی سکھ نہیں ملا اور نہ ہی سکون اور نہ ہی اس کا اب کوئی اصول رہا۔ وہ کہیں بھی کھڑا ہو کر دوستوں کے ساتھ گپ شپ کرتا۔ وقت بے وقت فضول گوئی کرتا دفتر سے اٹھ کر آوارگی کرتا، جدھر چاہتا منہ اٹھا کر چل دیتا۔ گھر اور گھر والی سے لگتا کوئی چاہ ہی نہیں رہی ہے۔ وہ ایک شکستہ دل انسان بن کر رہ گیا تھا۔

ریشما نیم بے ہوشی کی حالت میں باپ کے گھر پہنچا دی گئی تھی۔ اس کے آگے کی زندگی میں اندھیرا اور ماتم کرنے کے علاوہ بچا ہی کیا تھا۔ اس کا سامان اور طلاق کے کاغذات بھی گھر آ گئے تھے۔ ریشما کے والد یہ خبر سنتے ہی اس قدر دل برداشتہ ہوئے کہ ان کے اوپر شدید فالج کا حملہ ہوا اور وہ اپنا جسم اور زبان کھو بیٹھے وہ ریشما کو دیکھتے رہے، لیکن بول نہ سکے۔

ریشما نے اپنے برباد ہونے کی خبر چھپانے کی بہت کوشش کی، لیکن باپ کی آنکھوں نے سب کچھ دیکھ لیا، وہ باپ جس نے ماں اور باپ دونوں کی محبت دی اور اس کو پالا تھا اور اچھے مہذب گھرانے میں اس کی شادی کی تھی۔ ابا جی کی آنکھوں میں ریشما کے لئے کچھ سوال تھے۔ میں اپنی بیٹی کو کس کے حوالے کروں گا؟ میں تو مر جاؤں گا یہ تنہا کیسے زندگی گزارے گی۔

ریشما نے اپنے پیارے باپ کی کسمپرسی کو بھانپ لیا۔ ان کی خاموش آنکھوں کے آنسوؤں نے سب کچھ ان کے دل کا حال بیان کر دیا تھا۔ اس نے اپنے دل میں ایک فیصلہ کیا اور سوچا میرے پیارے باپ کا یہ آخری وقت ہے، وہ کب تک اس تکلیف کی شدت میں رہیں گے۔ صدیقی صاحب جب ابا جی کے کاغذات کا پلندا اس کے حوالے کر کے جانے لگے تو اس نے ان کو روک لیا یہ کہہ کر کہ صدیقی صاحب میں آپ سے ایک ذاتی سوال کرنا چاہتی ہوں۔ انہوں نے کہا:

''فرمایئے۔''

آپ نے شادی کیوں نہیں کی اب تک۔ ان کے چہرے پر ناگواری کی ایک شکن ظاہر ہوئی اور وہ یہ کہہ کر خاموش ہو گئے:

''کوئی مجبوری تھی'' اور موٹر میں بیٹھ گئے۔ ریشما بھی دروازہ کھول کر برابر میں جا کر بیٹھ گئی اور ان سے پوچھنے پر بضد ہو گئی۔ انہوں نے سختی سے کہا: ''بعض لوگ محرومیوں کے ساتھ پیدا کیے جاتے ہیں۔'' ریشما بولی:

''جی ہاں وکیل صاحب! قدرت انصاف پسند ہے، لیکن پھر بھی مردوں پر ایسے ظلم نہیں کرتی۔ یہ ظلم اور تشدد تو عورتوں کے حصہ میں ہے۔ میں ایک بانجھ عورت ہوں یہ بھی قدرت کے ہاتھ میں ہے۔ میرا اس میں کیا قصور، میرا ہنستا بستا گھر صرف اولاد نہ ہونے کی وجہ سے برباد ہو گیا مجھے طلاق دے کر گھر سے نکال دیا گیا۔ میرا قصور یہ ہے میں اپنے شوہر کو اولاد نہ دے سکی اور آپ نے دیکھا میرے بابا یہ صدمہ برداشت نہ کر سکے اور معلق ہو گئے، ان کی زبان بند ہو گئی۔ میں ان کی زندگی میں میں کسی ایسے شخص کے ہاتھوں میں خود کو محفوظ کر دینا چاہتی ہوں تا کہ وہ مجھے آباد دیکھ سکیں۔ وکیل صاحب میں آپ کے سامنے ایک سوالی بن کے آئی ہوں مجھے کچھ بھی نہیں چاہیئے، جب کہ کوئی بھی عورت اس طرح کا سوال نہیں کرتی۔ میں آپ سے بھیک مانگتی ہوں آپ مجھ سے شادی کر کے اپنی پناہ میں لے لیں۔ میں ساری عمر آپ کی خدمت کروں گی۔ آپ کی لونڈی بن کے رہوں گی۔ یوں بھی آپ کو اس عمر میں کسی ساتھی کی ضرورت

PDF Compressor Free Version



محسوس ہوگی۔'' اس کے یہ الفاظ سن کر وکیل صدیقی بھی آبدیدہ ہوگئے۔

دوسرے دن ہی چند دوستوں اور احباب کی موجودگی میں نکاح ہوگیا۔ ریشما کی عدت بھی ختم ہوگئی تھی اور وہ معمولی کپڑوں میں بیاہ کر وکیل صدیقی کی منکوحہ بن گئی۔ ابا جی بول نہ سکے، لیکن وہ ٹکر ٹکر دیکھتے رہے۔ ریشما نے ایک بڑی عمر کے مرد کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ وہ اس کو آباد دیکھ کر تیسرے دن پرسکون ہوگئے اور انہوں نے زبان کے ساتھ آنکھیں بھی بند کرلیں۔ نہ جانے یہ خوشی تھی یا صدمہ۔

صدیقی صاحب کا گھر اجڑا ہوا میلا پھیلا رہتا تھا۔ ریشما کے آتے ہی صفائی اور پاکیزگی کا گھر دلہن بن گیا۔ انہوں نے اپنے گھر کی یہ حالت دیکھی تو ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور کہا:

''کتنا بدنصیب وہ شخص تھا جس نے تمہیں طلاق دے کر تم جیسی بیوی کو اپنے سے علیحدہ کیا۔ یہی گھر پہلے ایک قبرستان تھا۔ ایک سلیقہ شعار بیوی کے آنے سے یہ جنت بن گیا۔ میں تو بہت خوش ہوں۔''

وہ جو تنہا رہنے سے بیمار رہتے تھے اب وہ بالکل خوش اور صحت مند نظر آتے ہیں۔ انہوں نے ریشما کو علیحدہ کار خرید کر دے دی تھی۔ اس نے کوئی ڈرائیور نہیں رکھا۔ وہ خود چلاتی، جہاں جانا ہوتا پہنچاتی۔ اکثر فرمان اس کو باہر کسی جنرل اسٹور یا کسی بھی چوراہے پر دیکھتا اور دیکھتا رہ جاتا۔ آج بھی وہ اپنی ایک سہیلی کے ساتھ ایک ریسٹوران میں بیٹھی تھی۔ فرمان نے اسے دیکھا اور وہ اپنے دل پر قابو نہ پاکر ریسٹوران میں اس سے ملنے چلا گیا اور اس کے سامنے والی خالی ٹیبل پر بیٹھ گیا۔ ریشما اسی طرح خوش شکل اور خوش لباس بیٹھی کافی پی رہی تھی، اس سے رہا نہ جارہا تھا، اس کا دل چاہا اس کی ساری خوشی اور اطمینان چھین لے۔ وہ جل اٹھا اسے خوش دیکھ کر، پھر اس کے قریب جاکر بولا:

''ریشما لگتا ہے تم بہت خوش ہو۔ تم شہر کے ایک مشہور وکیل اور بڑی عمر کے آدمی سے شادی کرکے آزادی سے گھومتی رہتی ہو۔'' یہ کہتے کہتے اس کی آنکھوں میں آنسو لرزنے لگے:

''میں دنیا کا سب سے بدنصیب آدمی ہوں جس نے تمہیں چھوڑ کر ایک ایسی عورت کو اپنی شریک حیات بنایا جو کسی بھی لحاظ سے میرے مدمقابل نہیں تھی۔ وہ بدصورت تو ہے ہی اتنی ہی بدمزاج بھی، البتہ بچے ضرور ہر سال پیدا کرکے لگتا ہے اس نے مجھے خرید لیا۔ ذرا ذرا سی بات پر جھگڑا کرنا، کوئی سلیقہ نہیں، گھر ایک گندگی کا ڈھیر نظر آتا ہے اب تو اماں بی سے بھی جھگڑا ہوتا رہتا ہے۔ مجھے تو ہر بات پر کہتی ہے کہ:

''تم تو ریشما کو چاہتے ہو اس سے اب بھی محبت کرتے ہو۔ مجھے تو لونڈی کی حیثیت سے رکھا ہے۔ بچے بھی بہت بدتمیز اٹھائے ہیں، نہ کسی کو سلام کرتے ہیں اور نہ ہی ادب سے بیٹھتے ہیں۔ میں تو زیادہ تر گھر سے باہر رہتا ہوں۔ تم تو زندگی سے خوش اور مطمئن نظر آرہی ہو۔ تمہارا شوہر تم سے بہت پیار کرتا ہے کیا۔'' ریشما نے کہا:

''میرا شوہر بہت اچھا اور ایک مہذب پیار کرنے والا انسان ہے، اسے بچے کی آرزو بھی نہیں ہے۔ فرمان صاحب آپ کے پاس سب کچھ ہے، لیکن پھر بھی تم خوش نہیں ہو یہ اپنی اپنی قسمت ہے۔''

اس نے کہا:

''ریشما میں نے تمہیں ٹھکرا کر اچھا نہیں کیا۔ اب تم سے بچھڑ کر احساس ہوا کہ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں بالکل ٹوٹ پھوٹ گیا ہوں۔ آؤ ہم پھر دوستوں کی طرح دوبارہ ملا کریں۔''

ریشما نے تیوری چڑھا کر غصہ سے پوچھا:

''دوست سے آپ کی کیا مراد ہے، فرمان صاحب، آپ کو اپنے دماغ کا علاج کرانا چاہئے۔ میں کسی کی شریک حیات ایک بیوی ہوں، کوئی بازاری عورت نہیں کہ جب دل چاہا رشتہ جوڑ لیا اور جب چاہا توڑ دیا۔ آپ کی یہ بات کہنے کی مجھ سے ہمت کیسے ہوئی اور آج کے بعد مجھ سے ملنے کی کوشش بھی مت کرنا کیونکہ آپ میرے لئے ایک غیر محرم ہیں۔'' یہ کہہ کر ریشما نے اس کو نفرت سے دیکھا اور اٹھ کر چلی گئی اور فرمان اسے حسرت سے دیکھتا رہ گیا۔

☆ محبت کی کشتی میں پہلا سوراخ شک ہوتا ہے
☆ سچی محبت صرف ایک بار ہوتی ہے اور سچی خوشی بخشتی ہے
☆ سچی محبت زمانہ، حالات اور دل و دماغ کی جنگ میں گم ہوسکتی ہے، مگر کبھی بھی مر نہیں سکتی
☆ جس سے سچی محبت ہو، اس سے مقابلہ نہیں کیا جاسکتا

PDF Compressor Free Version

قیصر زاہدی

Alamganj, Loharwa Ghat, Patna 800007 (Mob. 9097151497)

# کاش

کرتار سنگھ کا باپ ایک ٹرک ڈرائیور تھا اور چند ماہ قبل حرکت قلب بند ہوجانے کی وجہ سے اس کی موت واقع ہوگئی تھی۔ اس وقت کرتار کی عمر صرف تیرہ سال تھی۔ والد کی موت کے بعد گھر میں فاقے کی نوبت آگئی، تب اس نے اپنے والد کے جاننے والے ایک ٹرک ڈائیور سوہن لال کی شاگردی قبول کرلی اور اس کے ٹرک پر خلاصی کا کام انجام کرنے لگا۔ سفر کے دوران لائن ہوٹل اور ڈھابوں کا تڑکا روٹی اسے خوب راس آنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے چار پانچ سال کا وقفہ پلک جھپکتے گزر گیا اور لاغر سا کرتار گبھرو جوان بن گیا۔ سوہن لال کے کہنے پر اس نے اپنا ڈرائیونگ لائسنس بنوالیا۔ سوہن لال نے ٹرک مالک سے سفارش کر کے ایک ٹرک پر اسے ڈرائیور مقرر کرا دیا کیونکہ سوہن لال کی شاگردی میں رہ کر وہ ڈرائیونگ کے کام سے بھی واقف ہوگیا تھا۔ کل تک وہ ڈرائیوروں کو استاد کہہ کر پکارتا تھا، مگر اب وہ خود استاد بن گیا تھا اور خلاصی اسے استاد کہہ کر پکارنے لگے تھے۔

آج اسے ٹرک لے کر ایک ایسی گھاٹی کے پار جانا تھا جو بے حد اونچی نیچی اور پرخطر سڑکوں سے ہو کر گزرتی تھی۔ گھاٹی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کافی گہری کھائی تھی، اس لئے ڈرائیوروں کو بے حد چوکسی کے ساتھ اس گھاٹی کو پار کرنا پڑتا تھا۔ گھاٹی کی لمبائی پندرہ میل تھی اور اس کے دونوں سروں پر کئی ڈھابے تھے، جہاں ہر وقت تندور گرم رہتا جس کی وجہ سے یہاں پر خوب چہل پہل رہتی۔ بیشتر ڈرائیور گھاٹی پار کرنے کے قبل ان ہی ڈھابوں میں خوب شکم سیر ہو کر اپنی پسند کے انواع واقسام کے کھانوں کا لطف اٹھاتے۔ ان ڈھابوں میں مرغ، بریانی، پراٹھے، نان، چائے، سموسے، شراب اور سگریٹ ہر وقت دستیاب رہتا۔ ہر ڈھابے کے باہر پانچ، چھ پلنگڑی بچھی ہوتی جس پر ڈرائیور اپنی تھکان دور کرنے کی غرض سے آرام کرتے یا پھر مالش کرنے والوں سے اپنے جسم کی مالش کرواتے۔

اس گھاٹی کے متعلق ایک کہانی برسوں سے مشہور تھی کہ ایک عروس نو کی سواری جب اس گھاٹی سے گزر رہی تھی تو براتیوں سے بھری بس کھائی میں گر گئی تھی اور سارے لوگ لقمہ اجل بن گئے تھے۔ تب سے اکثر اندھیری راتوں کے پچھلے پہر وہ دلہن اپنی باہیں پھیلائے عروسی جوڑے میں نظر آجاتی ہے اور اس بدروح کی وجہ سے کسی نہ کسی گاڑی کو حادثے کا شکار ہونا پڑتا ہے۔

گھاٹی شروع ہونے کے قبل کرتار نے ایک ڈھابے کے قریب اپنا ٹرک روک دیا، خلاصی کو ریگولیٹر میں پانی ڈالنے اور شیشہ وغیرہ صاف کرنے کا حکم دے کر ایک پلنگڑی پر دراز ہوگیا اور اسی جگہ اپنی پسند کے کھانے اور شراب منگوالیا۔ کھانے کے بعد اس نے بوتل کی پوری شراب بھی حلق کے نیچے اتار لی۔ چلنے کے وقت اس نے شراب کی ایک بوتل اور کچھ بھنے ہوئے گوشت جسے آپ کباب کہہ سکتے ہیں، پیک کروا کر اپنے ساتھ رکھ لیا اور آگے کے سفر پر چل پڑا۔

تقریباً میل بھر راستہ طے کرنے کے بعد اس نے ڈگی میں رکھی شراب کی بوتل اور گوشت کا پیکٹ نکالا۔ اس کا ایک ہاتھ اسٹیرنگ پر تھا اور دوسرے ہاتھ میں شراب کی بوتل۔ دانتوں کی مدد سے بوتل کا کارک کھول دیا، شراب کے ساتھ کبھی کبھی گوشت کا ایک دو ٹکڑا بھی منہ میں رکھ لیتا۔ اس طرح گھونٹ گھونٹ پی کر اس نے شراب کی پوری بوتل خالی کردی۔ اس کی آنکھیں خمار آلود ہوگئیں تھیں اور وہ تھوڑا رومانٹک ہوگیا تھا اور ایک فلمی گانے کا بول دہرانے لگا تھا:

''لاگا چنری میں داغ چھپاؤں کیسے.....لاگا چنری میں.....''

PDF Compressor Free Version



''کیا استاد، لگتا ہے پورا موڈ بن گیا ہے۔''

یہ کہتے ہوئے خلاصی نے چٹکی لی۔ تب اس نے چہرے پر مصنوعی غصہ ظاہر کرتے ہوئے خلاصی کو کہا: ''چپ بے چپ'' دیکھتے ہی دیکھتے آسمان ابر آلود ہوگیا تھا اور چاند بادلوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنے لگا۔ گھاٹی میں بجلی کا انتظام نہیں رہنے کی وجہ سے چاند جب بادلوں میں چھپ جاتا تو ایسا لگتا جیسے گاڑی کسی اندھیرے غار سے ہوکر گزر رہی ہے، مگر جب بوندا باندی شروع ہوتی اور کبھی کبھی بجلی چمکتی تو دور دور تک دکھائی دے جاتا اور پہاڑوں پر استادہ کوئی لنڈ منڈ درخت ایسا لگتا جیسے کوئی اپنی باہیں پھیلائے کھڑا ہے۔ اچانک کرتار کو وہ دلہن یاد آگئی جس کے متعلق اس نے سن رکھا تھا کہ اکثر وہ اندھیری راتوں میں گھاٹی کی سڑک پر عروسی جوڑے میں اپنی باہیں پھیلائے کھڑی دکھائی دیتی ہے اور پھر مخالف سمت سے آتے ہوئے ایک ٹرک سے اس نے اپنے ٹرک کو ایک تیز جھٹکے کے ساتھ اس طرح کاٹا کہ ٹکرانے سے بال بال بچا۔

''استاد آنکھ لگ گئی تھی کیا؟''

خلاصی نے پریشان کن لہجے میں دریافت کیا۔

''کلوا تیرے کو نہیں معلوم ہے کہ پانچ سال کی ڈائیوری میں آج تک میں نے اپنی گاڑی کو ایک کھروچ بھی نہیں لگنے دی ہے۔''

اس نے لڑکھڑاتی آواز میں کہا، مگر خلاصی کو اچھی طرح اندازہ ہوگیا تھا کہ شراب نے استاد کو اپنے قبضے میں کرلیا ہے۔

آہستہ آہستہ کرتار سنگھ کی اسٹرینگ پر پکڑ کمزور ہوتی جارہی تھی، پھر وہ زیر لب بڑبڑانے لگا تھا:

''وہ .....وہ..... سامنے، لال..... لال..... جوڑے میں..... دلہن..... دلہن مجھے اپنے باہوں میں لینے کو.....'' تبھی خلاصی بے ساختہ چلایا: ''استاد گاڑی دائیں کاٹو.....و.....'' مگر اس وقت تک بہت دیر ہوچکی تھی۔ دل دہلا دینے والی ایک دھماکہ دار آواز دور دور تک گھاٹی میں گونج گئی۔

کاش! کرتار سنگھ اس حادثے میں زندہ بچ گیا ہوتا اور لوگوں کو بتاپاتا کہ کیا اس لال جوڑے والی دلہن نے اسے اپنی باہوں میں بھر لیا تھا یا شراب کی بوتل نے؟ ❁❁

## حیات انسانی کا نوحہ (ص ۳۵ سے آگے)

ہے کہ ہم یہاں آکر بھی یہاں موجود نہیں، گھر کی طرح یہاں بھی پنکھے اور اے سی کی ٹھنڈک ماحول کو یخ بستہ کررہی ہے۔ جانماز کا گداز پن گھر کے صوفے کی یاد دلا رہا ہے۔ دیواروں پر جگہ جگہ لگی ہدایات کی تختیاں دیکھ کر حیرت ہورہی تھی۔ خدا کے گھر میں انسانوں کی عائد کردہ پابندیاں کہیں خدائی احکامات سے تجاوز تو نہیں کررہی ہیں؟ ایک سوال پنڈولم بن کر اس کے سامنے رقص کرنے لگا۔

''چپل یہاں اتاریے۔''

''اپنا موبائیل بند رکھیے۔''

''دینادی باتوں سے پرہیز کیجئے۔'' وغیرہ ہدایات اس کا منھ چڑا رہی تھیں۔ وہ لمحہ لمحہ ان ہدایات کو پامال ہوتے دیکھ رہا تھا۔

تبھی اس نے دیکھا کہ امام صاحب بجلی کی سی سرعت سے داخل ہوئے اور نماز ادا کر کے دعا میں مصروف ہوگئے۔ دعا کا وقفہ نماز سے کئی گناہ زیادہ ہوگیا تو اسے خیال آیا کہ مزدوری تو محنت کے مطابق ہی ملتی ہے، پھر زیادہ مطالبے سے کیا حاصل؟ کسی طرح اس نے بقیہ نماز ادا کی اور پھر باہر نکل آیا۔ ❁❁

## ملن (ص ۳۸ سے آگے)

''شششش، میں آگیا ہوں نا ساجدہ تمہارے پاس'' لیکن اس کے آنسوؤں کی جھڑی تھی کہ رک ہی نہیں رہی تھی جیسے سیلاب روکے نہ رکے، لیکن فہد نے سمیٹ لیا۔

''میری گڑیا'' اور دھیمے دھیمے سسکیوں کا انداز بدلتا گیا۔

''افف صوفیہ'' فہد کی سسکاری نکلی اور ..... لمحے ساکت ہوگئے..... چند لمحے صدیوں پہ محیط.....

''ساجدہ'' فہد نے ایک کوشش کی پکڑنے کی، مگر ساجدہ مچھلی کی مانند پھسل گئی اور سیدھے غسل خانے میں۔ دھڑام..... دروازہ بند۔ نل سے بہتا ڈھنڈا یخ پانی اس کے جذبات کو پھر سے منجمد کرچکا تھا۔

❁❁❁

PDF Compressor Free Version



طنز و مزاح

فضل حسنین

A.7. Patrakar Colony, Ashok Nagar, Allahabad 211001 (Mob. 07499178776)

# احتیاط کا خبط

آپ جانتے ہی ہیں کہ تھوڑی بہت احتیاط تو ہر شخص کرتا ہے، لیکن بعض لوگوں کو احتیاط کا خبط سا ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں وہ اپنے ساتھ ساتھ متعلقین کی زندگی بھی اجیرن کر دیتے ہیں۔ ہمارے ایک ساتھی بھی ناقابل برداشت حد تک اس خبط میں مبتلا ہو چکے ہیں اور ان کا یہ مرض اب اتنا بڑھ چکا ہے کہ موصوف کے گھر والوں کے ساتھ ساتھ ہر وہ شخص اس کی لپیٹ میں آجاتا ہے جس کا موصوف سے ذرا بھی واسطہ پڑے۔ خاکسار بھی ان بدنصیبوں میں سے ہے جن کا موصوف سے برابر سابقہ پڑتا رہتا ہے۔ چونکہ موصوف مخلص بھی انتہائی درجے کے ہیں اور صرف خلوص ہی نہیں بلکہ ہر معاملے میں انتہا پسندی کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہر شخص ان کی تقلید کرے یعنی انتہا پسند بن جائے۔ جہاں تک ہماری بات ہے تو ہم بھی ٹھہرے اپنی دنیا کے بادشاہ، لہٰذا احتیاط صاحب، جی ہاں! اب موصوف کا نام ہی 'محتاط صاحب' رکھ دیا گیا ہے، ان سے نوک جھونک کا سلسلہ ٹوٹنے نہیں پاتا۔ محتاط صاحب کی کارستانیاں بیان کرنے کے لئے ایک دفتر درکار ہے، لہٰذا ہم یہاں بانگی کے طور پر چند ایک باتوں کے ذکر پر ہی اکتفا کریں گے۔

محتاط صاحب ہر اس معاملے میں بھی خطرے کا اندیشہ پیدا کر لینے میں ماہر ہیں جس کا ایک عام آدمی کو کبھی خیال تک نہ گزرے۔ کھانے پینے میں تو احتیاط کا عالم پوچھئے مت! صبح اٹھ کر سب سے پہلے گرم پانی سے ہاتھ دھوتے ہیں تاکہ دورانِ نیند جو جراثیم پیدا ہو گئے ہوں یا کسی اور طرح موصوف کے ہاتھ لگ گئے ہوں، وہ ختم ہو جائیں۔ اس کے بعد پھر اس طرح ہاتھ، منہ دھوتے ہیں جس طرح نارمل لوگ دھویا کرتے ہیں۔ ہاتھ دھونے کے سلسلے میں یہ بات بھی یاد رکھیں کہ موصوف کسی سے مصافحہ کرنے کے بعد بھی ہاتھ گرم پانی سے ہی دھوتے ہیں کہ کہیں ملاقاتی کے ہاتھ کی گندگی یا جراثیم موصوف کے ہاتھ میں منتقل نہ ہو جائیں، لہٰذا کسی ایسی جگہ جہاں گرم پانی مل پانے کا امکان نہ ہو، کسی سے ہاتھ ملانے سے کئی کاٹ جاتے ہیں۔

جراثیم کے خوف کا یہ عالم ہے کہ موصوف کھانے کے ساتھ مولی، گاجر وغیرہ بھی اُبال کر ہی استعمال کرتے ہیں۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ اُبل جانے پر مولی، گاجر کا ذائقہ کیسا ہو جاتا ہے، لیکن موصوف کا کہنا ہے کہ جان ہے تو جہان ہے۔ ذائقے کے پیچھے جان گنوا دینا دانشمندی نہیں۔ ہوٹل میں کبھی بھول کر بھی کچھ نہیں کھاتے پیتے۔ ہاں، چائے یا کافی اس خیال سے پی لیتے ہیں کہ وہ ان کے سامنے ہی کھولائی جاتی ہے۔ یعنی جراثیم کے کارگر رہ جانے کی گنجائش ہی نہیں باقی رہتی۔ پینے کے پانی کی بوتل ہمیشہ اس طرح ساتھ رکھتے ہیں گویا وہ بھی ان کے جسم کا حصہ ہو، کیونکہ باہر کا پانی پی لینا گناہ جانتے ہیں۔ سیل بند منرل واٹر کی بوتل پر اس لئے بھروسا نہیں کرتے کہ وہ ان کے سامنے سیل نہیں کی گئی ہوتی۔ کبھی ان کے ساتھ سفر کرنے کا اتفاق ہوتا ہے تو ٹرین یا بس میں سموسہ چائے وغیرہ کھاتے پیتے دیکھ کر ہمیں ایسی خونخوار نظروں سے گھورتے ہیں گویا ہم سے کوئی جرم سرزد ہو رہا ہو، اسی لئے حتی الامکان ہم ان کے ساتھ کہیں جانے سے گریز کرتے ہیں۔ لباس کے معاملے میں احتیاط کا عالم یہ ہے کہ گلابی جاڑا کیا بلکہ اس سے بھی کم ٹھنڈ پڑتے ہی جرسی اور مفلر کا استعمال شروع کر دیتے ہیں تو پھر اونی کپڑے ہولی کی آگ جل جانے کے بعد ہی واپس بکس میں بند ہو پاتے ہیں۔ آئس کریم جیسی ٹھنڈی چیز تو موصوف صرف جون کے مہینے میں ہی استعمال کرتے ہیں اور آسمان میں بادل کا پہلا ٹکڑا دیکھتے ہی ٹھنڈا پانی بھی پینا بند کر دیتے ہیں۔ اس کے باوجود موصوف کو کوئی نہ کوئی تکلیف لگی ہی رہتی ہے کیونکہ

PDF Compressor Free Version



حد سے زیادہ ہر چیز بری ہوتی ہے، لہٰذا حد سے زیادہ احتیاط بھی اکثر نقصان دہ ہو جاتا ہے۔

ہم نے تو ایسے بھی جیالے دیکھے ہیں جو ہر دم جان ہتھیلی پر لئے پھرتے ہیں۔ گزشتہ جنوری کی ہی بات ہے، ہم اپنے ایک دوست کے فرزند کے ولیمے میں شریک تھے۔ جنوری کی رات میں تقریباً گیارہ بجے ایک بڑے میاں جن کی کمر عمر کے دباؤ سے ٹیڑھی ہو چکی تھی، بائیں ہاتھ سے بھٹی میں آگ تاپ رہے تھے اور دائیں ہاتھ سے آئس کریم اس انہماک سے کھائے جا رہے تھے گویا دنیا میں بھیجے ہی گئے ہوں آئس کریم کھانے کے لئے۔ ہاں! تو ہم محتاط صاحب کی بات کر رہے تھے۔ موصوف گرمی، برسات یعنی تقریباً آٹھ ماہ چھتری کو سینے سے لگائے پھرتے ہیں کہ کہیں دھوپ یا پانی سے نقصان نہ پہنچ جائے۔

اب ہم کیا بتائیں۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے، چنانچہ موصوف کی صحبت میں رہتے رہتے نادانستہ طور پر یہ بیماری یعنی حد سے زیادہ احتیاط والی بیماری کا اثر ہم پر بھی ہونے لگا جس کے نتیجے میں اس بار ساون، بھادوں پورے دو ماہ ہم رین کوٹ (برساتی) اپنے پرس میں رکھ کر ہی گھر سے باہر قدم نکالتے۔ دراصل چھتری پرس میں سماتی نہ تھی اور ہر وقت رین کوٹ کھلے عام لے کر چلنے میں اس خیال سے شرم دامن گیر ہوتی کہ لوگ کیا سوچیں گے کہ بارش دیکھنے کو آنکھیں ترس گئیں اور بڑے میاں ہیں کہ رین کوٹ سینے سے جدا رکھنے کا خیال تک دل میں نہیں لا رہے ہیں۔ جس پرس میں ہم عموماً کتب و رسائل رکھ کر نکلتے تھے، اب اس میں رین کوٹ کا راج تھا۔ راستے میں دو چار بوندیں بھی گرتیں تو ہم جھٹ رین کوٹ نکال کر پہن لیتے، لیکن جیسے ہی رین کوٹ پہن چکتے، بوندا باندی بند ہو جاتی اور ہمارا خاصا وقت رین کوٹ تہہ کر کے پھر پرس میں ٹھونسے میں لگ جاتا۔ غرض یہ آنکھ مچولی راستے بھر چلتی رہتی۔ منزل مقصود پر پہنچ کر رین کوٹ پر گری بوندوں کا تخمینہ لگاتے تو اندازہ ہوتا کہ پورے راستے اتنی بوندیں بھی نہ پڑتیں کہ رین کوٹ ایک بار تو تر ہو جاتا۔

ہم آپ کو دل کی بات بتا ہی دیں کہ ہم احتیاط برتنے میں محتاط صاحب کا مقابلہ کیا کر پاتے۔ دراصل رین کوٹ ہر وقت ساتھ رکھنے اور بوند پڑتے ہی جھٹ اسے پہن لینے کی اصل وجہ یہ تھی کہ دھوپ سے بچنے کے لئے تو رین کوٹ پہنا نہیں جا سکتا، اس لئے اس کی قیمت صرف پانی سے بچ کر ہی وصول کی جا سکتی تھی۔ اسی خیال سے ہم اسے پہن لینے میں ذرا بھی تاخیر نہ کرتے کہ اس کی جتنی قیمت وصول ہو جائے غنیمت ہے۔ چنانچہ ساون، بھادوں بیت گئے، لیکن رین کوٹ میں پھنسی رقم کا دس پانچ فی صد بھی نہ وصول ہو پایا اور رقم ڈوب جانے کا اضافی غم تکلیف کا سبب بن گیا۔

بہر حال! محتاط صاحب کی صحبت کا اثر ہم پر گہرا ہوتا جا رہا ہے، لیکن مشکل یہ ہے کہ آپ کسی کے ساتھ ایک طویل مدت تک اگر اٹھ، بیٹھ لیں تو پھر وہ آپ کے جسم کا حصہ جیسا ہو جاتا ہے جسے کاٹ پانا آسان نہیں، اس لئے سب کچھ جانتے سمجھتے بھی ہم محتاط صاحب کا ساتھ چھوڑ دینے پر خود کو آمادہ نہیں کر پاتے جس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ اب ہم اپنے گھر میں بھی حد سے زیادہ احتیاط کرنے کے لئے سب کو ٹوکنے لگے ہیں۔ بیگم تو خیر اب ہمیں چھوڑ کر کہاں جائیں گی، لیکن بیٹا اور بہو ہمارے ٹوکنے پر اب منہ بنانے لگے ہیں اور آج تو اس وقت ہمارے کان کھڑے ہو گئے جب ہمارے چار سالہ پوتے نے جھلا کر کہہ ہی دیا:

''دادا تو ہر وقت پیچھے پڑے رہتے ہیں، یہ نہ کرو، وہ نہ کرو۔ دادا کچھ سمجھتے ہی نہیں، بس ہر چیز کو منع کرتے رہتے ہیں۔'' لیکن مجبوری یہ ہے کہ اب ہم عمر کی اس منزل پر پہنچ چکے ہیں جہاں ذہن پوری طرح ساتھ نہیں دیتا اور کسی کو نہ ٹوکنے کے لئے بار بار تہیہ کر لینے کے بعد ہم پھر نادانستہ طور پر ٹوک ہی دیتے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ حد سے زیادہ احتیاط والی عادت سے اکثر خود ہمیں بھی پریشانی ہو جاتی ہے۔ مثلاً اسی وقت ہمارا دل چاہ رہا ہے کہ آپ سے کچھ دیر اور باتیں کر کے جی ہلکا کر لیں، لیکن یہ احتیاط دامن گیر ہو چکی ہے کہ کہیں آپ ہماری باتیں پڑھتے پڑھتے اوب نہ جائیں، اس لئے دل کے ارمان دل میں ہی رکھتے ہوئے آپ سے یہ کہہ کر اجازت چاہیں گے کہ آپ کتاب یا رسالہ کم روشنی میں نہ پڑھا کریں، کیونکہ کم روشنی میں مطالعہ کرنا آنکھوں کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اوہ! پھر وہی احتیاط!

❁❁❁

PDF Compressor Free Version



منظومات

انور شمیم

C/o Book Emporium, Sabzibagh, Patna 800004 (Mob. 9939050290)

# آٹھ نظمیں

## پرندہ چہکتا ہے جاناں

بہت خوبصورت ہے جاناں!

بہت خوبصورت ہے وہ

کہ جو

فہم وادراک کے بے کراں جال سے بھی

کراں تا کراں جانے کتنا بڑا ہے

کسی کی پکڑ ہی میں آتا نہیں

دکھائی وہ دیتا ہے

ساری حسیں دیکھتی ہیں

بہت خوبصورت ہے وہ

پروں پر مچلتی ہوئی تتلیوں کے

سمندر کے نیچے بچھے

دوسرے ہی جہاں روپ میں

درختوں کے پتوں سے اٹکھیلیاں کرتی

الہڑ ہوا رنگ میں

لگاتار بارش کی سرگوشیوں اور

گھٹا روپ میں

سبکسار دریا کی لہروں کی معصومیت سے

جھلکتا ہوا

غضب ناک طوفان کی قہاریت میں

بپھرتا ہوا

سرشاخ خوشبو مہکتا ہوا

دم صبح، سورج

زمیں کی قدم بوسی کرتا ہے جب

ہم اسے دیکھتے ہیں

ہر اک رنگ میں اس کا اپنا جمال

پرندے کا دل موہتا ہے

پرندہ چہکتا ہے جاناں!

بہت خوبصورت ہے وہ!

## ذرا سا نور جاناں

خدائے نور وظلمت!

تری جانب

اندھیرے ٹکٹکی باندھے ہوئے ہیں

زمیں پہ

مستقل ڈوبی سیاہی میں

درختوں کی قطاریں

کرب دیدہ ہیں

شب تیرہ کے صحن بے اجالا میں

بہ رنگ صبح، پو پھوٹے

پیالوں میں اندھیروں کے

اجالا اک ذرا رکھ دے

ذرا سا نور جاناں!

پرندے مضطرب ہیں

گلے میں

اپنی چہکاروں کو رکھ کے

سنانے کو

ترانے

صبح گاہی کے

خدائے نور وظلمت!

خدائے نور وظلمت!

## ناچتے ناچتے گر پڑوں

ترے آسماں کو کبھی ایسا سوچا نہ تھا

ستاروں سے خالی،

سیہ رات کا استعارہ بھی ہوگا

PDF Compressor Free Version



بھیانک، بہت ہی بھیانک
جہاں ایک آہٹ بھی سارے بدن پہ
سرا سیمگی بو کے، کانٹے اُگا دے
ترے خاکداں کو، ترے اس جہاں کو
کبھی ایسا سوچا نہ تھا کہ یہ
سرکٹے زندہ سایوں کا مسکن بھی ہوگا
جہاں سانس
غول بیاباں میں یوں سہمی ہوگی
کہ جیسے درندوں میں گھر کر
ڈرا سا لرزتا ہوا میمنا
ترے آسماں کو، ترے اس جہاں کو
کبھی ایسا سوچا نہ تھا
کبھی جیسا سوچا تھا جاناں
اسے ویسا کر دے
کہ میں سارے سیارو ثابت کے سنگ
ترے پاؤں پہ
ناچتے ناچتے گر پڑوں!

## ایک لاختم سفر

زہر آلود دھواں!
دود مسموم بھرے کمرے میں
سانس گھٹ جانے کے
لاچار سے احساس عجب کے آگے
اک دیا جلتا ہے، یہ لگتا ہے
سانس لینے کو ابھی تھوڑی ہوا زندہ ہے
زور سیلاب کے نیچے اب بھی
مشت بھر خشک زمیں باقی ہے
سرخ سورج کے تلے سایہ ابر
بوند دو بوند ندی
دھند کے پار اُجالوں کی مہک
شاخ محزوں پہ غٹرغوں آواز
ملبۂ عصر کے نیچے پڑی دو آنکھوں میں
کچھ ہیں اسباب بھی رونے کے، مگر
زندگی جینے کے آثار بہت ہیں باقی
آؤ! ان روٹھتے لمحات کو جی لیں بھرپور
کیوں کہ آگے جو سفر ہے جاناں
ایک لاختم سفر
کوچہ انجان کا ہے!

## اوس کی بوندیں بچی رہیں

کیا جاگے کا سپنا جاناں
کیا سوئے کا خواب
بے چاہت آنکھوں کی چاہت
بے ارماں دل کا ارماں
نیلے پیلے، ہرے گلابی
دھاگوں سے کاڑھی چادر پر
رنگ رنگ کے گل بوٹے
گل بوٹوں کی پنکھڑیوں پر
تھرتھر کرتی اوس کی بوندیں
بچی رہیں
مٹی کی قالین پہ چھم چھم
مست دھمالیں، مچی رہیں
بے چاہت آنکھوں کی کوریں
سرمہ انجن رچی رہیں
بس، جاگے کا سپنا جاناں
اور سوئے کا خواب.....!

## اک نظم کا لکھنا ضروری ہے

سانس کو سرتال میں
اور زندگی کے ساز کو
آہنگ میں رکھنا نہیں ہے کیا؟
تو، چلو آؤ ادھر
اس صف میں آجاؤ
جدھر انساں گزیدہ
خاک کے پتلے کھڑے ہیں
اک سکوں کی سانس لینے کو
لو، قلم پکڑو، یہ اک تحفہ سنبھالو
قلم کی نب کو پاکیزہ کرو،
اک نظم لکھو
اس بلا کے پہر میں جاناں
محبت رنگ میں ڈوبی ہوئی
اک نظم کا لکھنا ضروری ہے

PDF Compressor Free Version



## صراحی

کچھ تو ایسا ہے جو بے چین کیے رہتا ہے
ورنہ کیا چاہیے تھا اور نظارہ کے لیے
ایک ہنستا ہوا منظر سر آئینہ، بس
طفل ناداں کی ہنسی
ایک آواز سی قل قل کی
صراحی کے گلے سے نکلی
اور کیا چاہیے تھا
ایک ہنستا ہوا منظر سر آئینہ، بس
اندر اندر ہی تہی ہوتا ہوا
جام بھرتا ہوا سب ہاتھوں کے
کھلکھلاتا ہوا ہنستا جاتا
مثل
مٹی کی صراحی جاناں!

## یہی وقت تو

ابھی صبح کاذب نے
شبنم سے بھیگے ہوئے بال پونچھے نہیں ہیں
ابھی ملگجے نے
شب تار کی اوس سے نم لبادہ اتارا نہیں ہے
چلی ہے ابھی، بس ابھی ہی چلی ہے
خنک سی ہوا
سانس کو عطر پرور مہک سے بھگوتی ہوئی
یہی وقت تو
رات بھر سوئے پیڑوں پہ ملہار ہونے کا ہے
ذرا دیر میں، بس ذرا دیر ہی میں
منادی یہ گزرے گی جاناں!
چلے آؤ سب لے کے اپنی جبین نیاز
کہ یہ وقت
سونے سے بہتر ہے، صف باندھ لو
کہ کوئی نہ بندہ رہے اور نہ بندہ نواز
ذرا دیر میں
بس ذرا دیر ہی میں، منادی یہ ہونے کو ہے
یہی وقت جاناں!
یہی وقت تو
باوضو ہو کے رونے کا ہے
یہی وقت تو
نوک خامہ سے کاغذ بھگونے کا ہے
یہی وقت تو
حرف زرتاب مٹی میں بونے کا ہے
یہی وقت تو، ہاں یہی وقت تو
نظم ہونے کا ہے

❁❁❁

## یہ دنیا

اختر قادری

("سرودِ نو" سے ماخوذ)

یہ دنیا کشمکش کی، جبر کی، پیکار کی دنیا
یہ دنیا کلفتوں کی، رنج کی، آزار کی دنیا
یہ دنیا جس میں ہر سو ظلم کی ہے گرم بازاری
یہ دنیا جس میں ہر گوشے میں پلتی ہے سیہ کاری
یہ دنیا جس میں لفظ رحم ہے معنی سے بیگانہ
یہ دنیا جس میں ہمدردی ہے خود غرضی کا بیعانہ
یہ دنیا جس میں نیکوں کو نہیں جائے اماں کوئی
یہ دنیا جس میں کیکس کی نہیں سنتا فغاں کوئی
یہ دنیا جس میں سفلے مورد الطاف و عزت ہیں
یہ دنیا جس میں اہل علم و عرفاں بے حقیقت ہیں
یہ دنیا جس میں ہے فقدان الفت کا، مروت کا
یہ دنیا جس میں ہے طغیاں نفرت کا، عداوت کا
یہ دنیا جس میں خون کمزور کا پانی سے ارزاں ہے
یہ دنیا جس میں جو شہ زور ہے فرعون ساماں ہے
یہ دنیا جس میں کم ظرفوں کو حاصل جاہ وسطوت ہے
یہ دنیا جس میں نخوت ہے، کدورت ہے، شقاوت ہے
الٰہی ایں جہاں بافطرت ما در نمی سازد
جہان تازہ پیدا کن کہ طرح دیگر اندازد

PDF Compressor Free Version



سید تحسین گیلانی

497, President Styen Street, Pretoria North
Pretoria, South Africa

## کیا غلط ہے.....؟

میں اگر سورج پہن لوں
روشنی کی شال اوڑھوں
رات کا چہرہ ٹٹولوں
مست ہولوں
بے سبب ہی مسکرا لوں
خواہشیں سولی چڑھا لوں
راستوں کو اپنے قدموں میں سمو لوں
تھوڑا ہنس لوں، تھوڑا رو لوں
اپنے اندر بہتے چشموں میں نہا لوں
اپنی بے تابی کی میت کا
ذرا نوحہ میں کر لوں
وندنای وحشیانہ رقص کرتی
اس ہوا کے ہونٹ چوموں
آج سجدوں میں اتر کر
میں ابد کے قفل کھولوں
گنگ ہو کر بھی پکاروں اور بولوں
چشم دل کے آنسوؤں سے روح دھولوں
آج اگر میں گڑگڑا لوں
کیا غلط ہے؟
کیا غلط ہے.....؟

❁❁❁

سلیم شہزاد

Shahzad Jewellers, Liaquat Bazaar, Quetta Cant
Balochistan (Mob.923003888463)

## پوری نیند اور آدھے خواب

پھر ملتے ہیں خوابوں میں
کہتا ہے ہر بار!

میں ناں مانوں یار
خوابوں کے اسرار
وحشت دل میں بھر دیتے ہیں
یعنی صحرا کر دیتے ہیں
لال سیاہی کی منظر میں
کوئی ہجرت کر جاتا ہے
پلکوں کے اس پار
سات سمندر پار

جانے کب وہ لوٹ آئے پھر
سوچتا ہے ساحل بھی، میں بھی
یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی

بارش کی امید میں یارب
سوکھ گئے تالاب!
یہ بھی کیا دستور ہے مالک
اپنا حصہ راکھ اور بس
پوری نیند اور آدھے خواب
پلکوں پہ کوئی خواب اتار
ملنے کے اسباب اتار
پورا کوئی خواب اتار

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

نصرت مہدی

Secretary, Bhopal Urdu Academy, Bhopal

# غزلیں

(۱)

یہ سوچئے کہ کیوں ہوا پہ زور چل نہیں رہا
کسی بھی رخ سے آپ کا چراغ جل نہیں رہا
غلط ہے یہ کہ وقت کی جبیں پہ بل نہیں رہا
مگر یہ پہلی بار ہے کہ بل نکل نہیں رہا
میں آزمائشوں میں اس مقام تک تو آ گئی
کہ آگ میں کھڑی ہوں اور جسم جل نہیں رہا
سفر میں اک ہجوم تھا ، مگر یہ راز اب کھلا
کہ کوئی بھی یہاں کسی کے ساتھ چل نہیں رہا
حرارتیں تو آگئیں تمازتوں تلک مگر
ہے درمیاں جو برف کے ، پہاڑ گل نہیں رہا

(۲)

عاجزی آج ہے ، ممکن ہے نہ ہو کل مجھ میں
اس طرح عیب نکالو نہ مسلسل مجھ میں
زندگی ہے مری ٹھہرا ہوا پانی جیسے
ایک کنکر سے بھی ہو جاتی ہے ہلچل مجھ میں
آج بھی ہے تری آنکھوں میں تپش صحرا کی
کروٹیں لیتا ہے اب بھی کوئی بادل مجھ میں
خواہشیں آ کے لپٹ جاتی ہیں سانپوں کی طرح
جب مہکتا ہے تری یاد کا صندل مجھ میں
اب وہ آیا تو بھٹک جائے گا رستہ نصرت
اب گھنا ہوگیا تنہائی کا جنگل مجھ میں

(۳)

رُت خزاں کی ہے اور ہری ہوئی ہے
شاخ گل تو ، تو باوری ہوئی ہے
کیا اڑانوں کو حوصلہ دے گی
اے ہوا تو تو ڈری ہوئی ہے
زندگی مل کبھی تو ، فرصت سے
بات ابھی تجھ سے سرسری ہوئی ہے
کوئی منظر نہیں ہے آنکھوں میں
رتجگوں کی تھکن بھری ہوئی ہے
قربتیں کروٹیں بدلتی ہوئی
اور انا بیچ میں دھری ہوئی ہے
یہ جو بیٹھے ہیں سر جھکائے ہوئے
آج ان سے کھری کھری ہوئی ہے
خود کلامی ہے یہ تری نصرت
مت ابھی سوچ شاعری ہوئی ہے

PDF Compressor Free Version

سیدہ شانِ معراج

Tareen Tikli, Opp. Mohan Nursing Home
Shahjahanpur 242001 (U.P.) (Mob. 9450443223)

# غزلیں

زندگی کو تو بہر طور گزر جانا تھا
موت کو موردِ الزام ٹھہر جانا تھا

لے اڑا مجھ کو سر راہ گزر کس کا خیال
کچھ بھی اب یاد نہیں ہے کہ کدھر جانا تھا

میں نے ہر خواب کو پتھر میں تراشا لیکن
میرے ہر خواب کی قسمت میں بکھر جانا تھا

دھوپ کرتی رہی کیوں اونچے مکانوں کا طواف
اس کو ہر سیلتے آنگن میں اتر جانا تھا

عمر یادوں کی بڑھا دی غم تنہائی نے
پہلے ہم نے بھی اسے زہر اثر جانا تھا

اب وہی اشک ملے خاک میں ایسے کہ نہ پوچھ
جن کو بھولے سے کبھی لعل و گہر جانا تھا

اب پریشان ہو کیوں راہِ طلب میں اے شانؔ
شام ہوتے ہی تمہیں لوٹ کے گھر جانا تھا

❁❁❁

روز نیزوں پہ تمناؤں کے سر آتے ہیں
اب مری فتح کے آثار نظر آتے ہیں

یاد کا سنگ گراں روح کی گہرائی میں
ڈوبتا ہے تو کئی زخم اُبھر آتے ہیں

دل سے مجبور بھی ہم ، صاحب پندار بھی ہم
آستاں سے ترے کترا کے گزر آتے ہیں

وہ ترا درد سہی ، وقت کے ہاتھوں کو مگر
تھپکیاں دے کے سلانے کے ہنر آتے ہیں

زندگی کرتی نہیں ٹوٹتے رشتوں سے وفا
سارے الزام مگر موت کے سر آتے ہیں

دل میں مت ڈھونڈ کہ اے طالب ایثار و وفا
اب یہ الفاظ کتابوں میں نظر آتے ہیں

سارے دن کرتے ہیں ہم دشت تمنا کا سفر
گرد چہرے پہ لئے شام کو گھر آتے ہیں

شانؔ اب ہم کو تو اکثر شب تنہائی میں
نیند آتی نہیں اور خواب نظر آتے ہیں

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

سید ضیاء الرحمٰن ضیاؔ

Friend's Colony, Katra Mandai, Sultanganj, Patna (Mob. 9304616490)

# غزلیں

سب غور و فکر کا یہی لب لباب ہے
یہ رنگ و بوئے گلشن ہستی سراب ہے
ہر چیز کی مثال ہے ، ہر شے کا ہے جواب
بس ایک تیری ذات ہے جو لاجواب ہے
کیسا شعور و فکر میں آیا ہے انقلاب
کانٹوں سے قرب ، پھولوں سے اب اجتناب ہے
جس کا نشہ اترتا نہیں ہے کسی طرح
جامِ انا میں آپ کے کیسی شراب ہے
اک چاندنی سی بکھری ہے دل کی زمین پر
کیا آسمانِ دل پہ کوئی ماہتاب ہے
بندوں کی سب خطائیں ہیں تیرے شمار میں
تیرے کرم کی حد ہے ، نہ کوئی حساب ہے
روشن سحر کے سپنے دکھائے گئے مگر
گم تیرگی میں آج بھی تعبیر خواب ہے
جھلسا کے رکھ نہ دے کہیں انسانیت کو یہ
تہذیب نو کا سر پہ نیا آفتاب ہے
اس طرح رہئے آپ مسائل کے درمیاں
خاروں کے بیچ جیسے شگفتہ گلاب ہے
پڑھنا جسے ہے پڑھ لے ضیاؔ رمز کائنات
از فرش تا بہ عرش کھلی اک کتاب ہے

❁❁❁

کیا عجب انداز اب جینے کے ہیں
شہر میں سب کے مکاں شیشے کے ہیں
جن کو منزل آشنا میں نے کیا
اب وہی پتھر مرے رستے کے ہیں
ہم سے شرح آبرو مت کیجئے
جانتے ہیں کون کس رتبے کے ہیں
تھا جہاں موجود اک کاخِ انا
اب وہاں پر ڈھیر بس ملبے کے ہیں
خون کی نسبت بھی بے مطلب ہوئی
آج رشتے سب یہاں پیسے کے ہیں
بحر و بر میں جو بھی ہیں رنگینیاں
سب مظاہر اس کے ہی جلوے کے ہیں
زندگی ہے ریگزاروں کا سفر
ریت پر دھو کے یہاں چشمے کے ہیں
کل نقیب حق کا دعویٰ تھا جنہیں
آج وہ بھی ہم نوا جھوٹے کے ہیں
کاروبارِ خاکداں میں مت الجھ
یہ سبھی سودے ضیاؔ گھاٹے کے ہیں

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

سعید رحمانی

Editor "Adabi Mahaz" Akhbar-e-Orissa Publications,
Dewan Bazar, Cuttack 753001 (Orissa)

# غزلیں

تعلق کو سلیقے سے نبھانے کی ضرورت ہے
ہمیشہ دوستو! ملنے ملانے کی ضرورت ہے

جہاں سے رزق پاتی ہے ہر اک مخلوق دنیا کی
اسی کے در پہ سر اپنا جھکانے کی ضرورت ہے

خوشی میں لطف آنا ایک فطری بات ہے لیکن
غموں میں بھی ہمیشہ مسکرانے کی ضرورت ہے

وہ کہتے ہیں کسی قاتل کے ہاتھوں سونپ کر گدی
زمین ہند کو مقتل بنانے کی ضرورت ہے

بہت شاطر ہے دشمن ، زیر کرنے کے لئے اس کو
نئی ترکیب کوئی آزمانے کی ضرورت ہے

کہیں سیلاب کا پانی نہ اونچا سر سے ہو جائے
جو سوتے ہیں انہیں پہلے جگانے کی ضرورت ہے

سعید اس چلچلاتی دھوپ میں نکلے ہو تم گھر سے
تو پھر سر پہ دعا کے شامیانے کی ضرورت ہے

❁❁❁

شاعری میں جو کبھی آپ نئی بات کریں
یہ ضروری تو نہیں ترک روایات کریں

پیار کی خوشبو سے مہکیں گی فضائیں دل کی
آؤ تقسیم زمانے میں یہ سوغات کریں

شخصیت آپ کی کچھ اور نکھر جائے گی
شرط بس اتنی ہے تطہیر خیالات کریں

غم کا موسم بھی ہمیں دیتا ہے خوشیوں کی نوید
رات دن کس لئے پھر شکوۂ حالات کریں

گرچہ سنجیدگی اوڑھے ہوئے رہتے ہیں جناب
دوستوں سے تو ذرا کھل کے ملاقات کریں

عاجزی شرط ہے اظہار طلب میں اے سعید
جب رقم ہونٹوں پہ ہم اپنی مناجات کریں

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

ڈاکٹر ذکی ہاشمی

Deptt. of Urdu, Urdu College, Gopalganj (Bihar) (Mob. 9934479225)

# غزلیں

حریف دیکھتے ہیں ایڑیاں رگڑتے ہیں
جب آندھیوں میں ہمارے چراغ جلتے ہیں

حقیقتوں کو حقیقت وہ مانتے ہی نہیں
نہ جانے کون سے وہم و گماں میں رہتے ہیں

خدا ہی جانے ہمیں کب شعور آئے گا
فریب کھاتے ہیں پھر بھی نہیں سنبھلتے ہیں

قدامتوں سے محبت ہمیں بھی ہے ، لیکن
قدم ملا کے زمانے کے ساتھ چلتے ہیں

اک ایک لمحہ گزرتا ہے اک صدی کی طرح
یہ زندگی ہے تو پھر موت کس کو کہتے ہیں

رُلانے لگتی ہیں یادیں ہمارے پرکھوں کی
ہم اس مکان کے سائے سے جب گزرتے ہیں

ذکی یہ عشق وہ ساگر ہے جس کی حد ہی نہیں
جو ڈوب جاتے ہیں اس میں کہاں نکلتے ہیں

❁❁❁

جو ان کے دل میں تھا پورا وہ انتقام ہوا
یہی تو جشن منانے کا اہتمام ہوا

کدورتیں رہیں اس طرح دونوں کے دل میں
بروزِ عید بھی رسماً دعا سلام ہوا

ہمیں شکار بنایا بڑے سلیقے سے
ہر ایک جرم تمہارا ہمارے نام ہوا

ضرورتیں مری چوکھٹ پہ منتظر ہوں گی
اب آؤ لوٹ چلیں گھر کہ وقت شام ہوا

ابھی تو اور بھی ہیں منزلیں نگاہوں میں
یہ مت سمجھ کہ ہمارا سفر تمام ہوا

کسی نے روکا نہیں سرپھری ہواؤں کو
تمام رات چراغوں کا قتل عام ہوا

اجل کے بعد بھی زندہ جو رکھ سکے اس کو
ابھی ذکی پہ وہ نازل کہاں کلام ہوا

❁❁❁

PDF Compressor Free Version

## شبانہ عشرت

C/o Md. Faizan Ahmad, Near Sona Medical, Dargah Road,
Pathar Ki Masjid, Patna 800006 (Mob. 8409722347)


# غزلیں

مری ہر نظر تنہا ، سونی رہ گزر تنہا
زندگی کے صحرا میں کر رہی سفر تنہا

دھوپ ہے، نہ بادل ہے، چھاؤں ہے، نہ آنچل ہے
بھیگتی رہی میری یونہی چشم تر تنہا

آپ کو مبارک ہو محفلیں بہاروں کی
میرا کیا اگر میری ہوگئی سحر تنہا

زندگی کے میلے میں کس کو ہے خبر اس کی
کوئی پھر رہا دیکھو در بدر مگر تنہا

بے وفا زمانے سے حرف التجا کیسا
ہو سکے تو کر لینا زندگی بسر تنہا

روپ وہ لٹاتا ہے چاندنی اسی کی ہے
پھر بھی شب کے دامن میں کس قدر قمر تنہا

❁❁❁

سزائے عشق سے اب تک نجات پا نہ سکی
میں اس کے کوچے سے اٹھ کر کہیں بھی جا نہ سکی

تمام عمر پھری مثل برگِ آوارہ
مرا نصیب کہ منزل قریب آ نہ سکی

غموں کے وار سے لب پر لگے تھے یوں تالے
ہزار چاہ کے بھی میں تو مسکرا نہ سکی

یہ کن صداؤں کا دل بھی اسیر ہے اب تک
یہ کیسی قید کہ پھر بھی قدم بڑھا نہ سکی

نظر نظر سے جو پوچھا کوئی جواب نہ تھا
نگاہ دل پہ جو ڈالی تو لب ہلا نہ سکی

جو تو کہے تری خاطر تیاگ دوں دنیا
ترے خلاف قدم میں کبھی اٹھا نہ سکی

مرے وجود ، مری زندگی کا تو مختار
کہ ایک حرفِ مقدر بھی میں مٹا نہ سکی

❁❁❁

PDF Compressor Free Version



انجم باروی
I-92, Rameshwarpur Road, Matiabruj, Kolkata 700024
(Mob. 9331775376)

# رباعیات

قندیل محبت کی جلا لو پہلے
انسان کو انسان بنا لو پہلے
تخریب میں مل جائے گی تم کو تعمیر
سوئی ہوئی تقدیر جگا لو پہلے

❁❁❁

ہر راز کی تفسیر بدل جائے گی
تدبیر سے تقدیر بدل جائے گی
تم اپنے عزائم پہ رہو تو قائم
آئینے میں تصویر بدل جائے گی

❁❁❁

دریائے مشیت کی روانی دیکھو
ہر وقت نہ یوں خواب جوانی دیکھو
کیوں دل پہ مسلط ہے ہوس کا غلبہ
غفلت سے اٹھو ، عالم فانی دیکھو

❁❁❁

انسان کی عظمت کو تو عظمت سمجھو
ہر شے میں ہے اک حسن و حقیقت سمجھو
ہر سانس ہے پیغام اجل اے انجم
جو وقت گزر جائے غنیمت سمجھو

❁❁❁

آر۔ کے۔ روشن
Marwadichali, Behind Shanidev Mandir, Dudheshwar Road
Ahmedabad 380004 (Mob. 9377344741)

# دوہے

حسن کا سکہ دور تک بے شک ہی چل جائے
مگر زیادہ دیر تک کبھی نہ چلنے پائے

❁❁❁

بھائی کا سرکاٹ کر پہنا تھا جو تاج
بیٹے نے سرکاٹ کر پہنا ہے وہ آج

❁❁❁

پہنی ہیروں کی گھڑی بدل گئے حالات
قیمت میرے وقت کی بڑھ گئی راتوں رات

❁❁❁

اپنے مطلب کے لئے پہنایا ہے ہار
بنا لیا ہے آپ نے پھول کو بھی ہتھیار

❁❁❁

خوبی کسی غریب کی مت کر تو پامال
یہ ہے گنگاجل اسے نالی میں مت ڈال

❁❁❁

تو ہے بہتر رہ نما لیکن کر یہ غور
تیری منزل اور ہے میری منزل اور

❁❁❁

دی ہے مالک نے تجھے کیسی گندی زبان
بدبو تیری بات کی سہہ پاتے نہیں کان

❁❁❁

PDF Compressor Free Version



# کتابوں کی دنیا

| | | | |
|---|---|---|---|
| نام کتاب | : | منتخبات شاؔد عارفی | |
| مرتب وناشر | : | ڈاکٹر مظفر حنفی | |
| اشاعت | : | ۲۰۱۵ء | صفحات : ۳۳۶ |
| قیمت | : | ۳۵۰ روپے | |
| مبصر | : | ڈاکٹر نسیم اختر | |

اردو درس وتدریس، تحریر وتصنیف اور شعر وسخن کا ایک محترم و ممتاز نام پروفیسر مظفر حنفی ہے۔ کسی کتاب پر موصوف کا اظہار خیال کر دینا ہی اس کی اہمیت وافادیت کا علامیہ ہے اور جو کتاب خود ان کی مرتب کردہ ہو وہ اس کی بقائے دوام کا ضامن بھی ہے، وجہ امتیاز بھی اور باعث اعتبار بھی۔ ''منتخبات شاؔد عارفی'' کے نام سے ہی شاعر، صنف اور موضوع کا تعین ہو جاتا ہے۔ اس مجموعہ کلام کی ابتدا میں پروفیسر مظفر حنفی کی چار صفحات پر مشتمل تحریر ''اردو ادب میں شاؔد عارفی کا مقام'' شاؔد عارفی کی سخنوری کے ضمن میں وہ شاہ کلید ہے جس سے شاعر کی قادر الکلامی کے مختلف باب کھلتے ہیں۔ کتاب کے صفحہ ۲۰ پر شاؔد عارفی کی نظموں کے محاسن پر خلیل الرحمٰن اعظمی کے جامع تبصرہ اور صفحہ ۱۹۶ پر فرمان فتح پوری کے وقیع اقتباس سے شاؔد کی غزل گوئی کے اوصاف پر روشنی پڑتی ہے۔

شاؔد عارفی کے کلام نے ایک طویل عرصہ سے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر رکھا ہے۔ انہوں نے نعت اور منقبت کے علاوہ نظم، غزل، رباعی، قطعہ، سہرہ، تہنیتی نظم، گیت، بشمول طنزیہ نظم اور غزل جیسے معروف اصناف سخن میں اپنی قادر الکلامی کے نمونے پیش کیے ہیں۔ ان کے کلام کا تازہ ترین انتخاب ''سلام بہ حضور سلطان مدینہ'' سمیت ۵۲ نظموں اور (ایک نعت جو غزلیں کے تحت رکھی گئی ہے) ۱۲۸ غزلوں پر محیط ہے۔ تعداد کے اعتبار سے غزلیں زیادہ ہیں۔ کچھ نظموں کے عنوانات یہ ہیں ''شادی کے بعد''، ''بہتان''، ''دسہرا اشنان''، ''شوفر''، ''نمائش (۱) تا نمائش (۴)''، ''گنگا اشنان''، ''دیوالی''، ''مہترانی''، ''بھکارن''، ''مال زادیاں اور دلال''، ''جنس جمیل''، ''نصف بہتر''، ''ابھی جبل پور جل رہا ہے''، ''ان اونچے اونچے محلوں میں''، ''آپ کی تعریف''، ''یہ ہماری زبان ہے پیارے'' وغیرہ۔ غزلوں کے چند مطلع بھی ملاحظہ فرمائیں جو بیک نظر متوجہ کرتے ہیں۔

شاؔد مغموم جو مسرور نظر پڑتا ہے
سچ کہا ہے کہ تخلص کا اثر پڑتا ہے

ہلکے پھلکے طنز سے گویا ٹکڑے ٹکڑے پتھر دیکھا
جس نے مجھ کو گھور کر دیکھا، میں نے اس کو ہنس کر دیکھا

بہ پاس احتیاط آرزو یہ بارہا ہوا
نکل گیا فریب سے وہ حال پوچھتا ہوا

نظر بچا کے مجھ کو وہ مجھ میں اس کو دیکھتا رہا
جبھی تو کہہ رہا ہوں کامیاب مدعا رہا

جنہیں بھی خواہ موسم گل پیام سیر بہار دیں گے
جلے ہوئے آشیاں انہیں ہر قدم پر اک اشتہار دیں گے

شاؔد عارفی کی شاعرانہ عظمت کے حوالے سے پروفیسر مظفر حنفی نے پیش نظر مجموعہ کے شروع میں جو باتیں کہی ہیں اگر جستہ جستہ ان کے اقتباسات ذہن نشیں رہیں تو شاؔد کی فکری وفنی تہہ داری، ان کے موضوعات کی بوقلمونی اور تنوع کے ساتھ شعری ہیئت وساخت کے افہام وتفہیم میں آسانی ہوگی:

☆ ''.....امام المتغزلین، حسرتؔ موہانی نے اردو غزل کو تصنع، نمائش اور مبالغہ کی راہ سے ہٹا کر جس خلوص کے ساتھ اسے ہندوستانی فضا سے روشناس کرانا

PDF Compressor Free Version



چاہا تھا اس کی تاریخی اہمیت برحق، لیکن..... وہ کلی طور پر گل وبلبل کی روایتی شاعری سے دامن کش نہیں ہو سکے۔ شاؔد عارفی کی عشقیہ غزلوں کے وسیلے سے ہمیں حقیقی معنوں میں پہلی بار ہندوستانی گھریلو محبت اور متوسط طبقے کے جیتے جاگتے، مانوس عاشق ومحبوب اردو شاعری میں نظر آتے ہیں..... اس میدان میں روز اوّل تا آخر..... آتش بھی بہ لحاظ تعداد ومعیار شاؔد عارفی کی سطح سے نیچے رہ جاتے ہیں۔''

☆''..... شاؔد نے پہلی بار خالص طنز کو اپنا فن قرار دے کر اپنی ایک انفرادی راہ تلاش کی جس میں قدما سے عہد حاضر تک ان کے سامنے اکبر یا کسی بڑے سے بڑے شاعر کا چراغ نہیں جل سکا۔''

☆''یگانہ چنگیزی کی طرح ان کا لہجہ اور آواز دور سے پہچان میں آنے والی چیز ہے..... البتہ وسعت نظر موضوعات کے تنوع اور سماجی مقصدیت کے اعتبار سے شاؔد عارفی، یگانہ چنگیزی سے بلند ہیں۔''

☆''شاعری میں الفاظ کے ساتھ جمہوری برتاؤ کرنے میں وہ اپنے ہم عمر تمام شاعروں سے آگے ہیں۔ اس باب میں ان کے ساتھ صرف نظیر اکبر آبادی کا نام لیا جا سکتا ہے۔''

☆''..... انہیں میر، غالب اور اقبال کے بعد اردو ادب کے گنتی کے ان چند بڑے اور ممتاز فنکاروں کی صف میں جگہ دینی ہوگی جن کی تعداد دس پندرہ سے زیادہ نہیں ہے۔'' (اردو ادب میں شاؔد عارفی کا مقام، ص ۱۶ تا ص ۱۸)

''سلام بہ حضور سلطان مدینہ'' کے بعد مجموعہ کی سب سے پہلی نظم ''شادی کے بعد'' ہے اس کے بعد ''بہتان''، ''دسہرا اشنان''، ''شوفر''، ''نمائش''، ''مشورہ''، ''اندھیر نگری بیٹے کی شادی''، ''گنگا اشنان''، ''دیوالی''، ''مہترانی'' وغیرہ جیسی نظمیں ہیں۔ ظاہر ہے مرتب کلام نے شاؔد کی اکیاون نظموں میں نظم ''شادی کے بعد'' کو اولیت کا درجہ دیا ہے۔ اس کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

جوش، جوانی، جھلکی الفت، قاصد، کوشش، منگنی، بیاہ
شادی تک ہی سب افسانے پھر ہستی کی سیدھی راہ
آغازِ عشرت پر گویا اب کوئی افتاد نہیں
شادی ایسا باغ کہ جس میں بلبل ہوں صیاد نہیں
بھوکا ننگا کوئی نہیں ہے، راج اندر کا سا دیش
یکساں نرخ نخود و گندم، چیزیں مہنگی بیش از بیش
''ساس نند'' گالی گفتاری، اس جنت کی رسم نہیں
لٹھے ململ کا خمیازہ جز ''کمبخت وبدشم'' نہیں

نظم ''بہتان'' کے یہ اشعار۔

ابھی شور روم جس نے چھوڑا ہے
شعر ہے بہترین جوڑا ہے
ان کا بچہ اگر نگوڑا ہے
اپنی دوہار پر گیا ہوگا
اپنی نہار کی خطا ہوگا
کیچلی جھاڑ کر بڑا ہوگا

''آپ کی تعریف'' کا یہ شعر۔

اس تامل میں کہ ہو جائے نہ جیل
ملتے ہیں اشعار پر سانڈے کا تیل

اور ''نصف بہتر'' کی خوبی یہ ہے کہ۔

فخر ہے مجھ کو کہ جاہل ہے مری گھر والی
اتنی جاہل ہے کہ پابند نماز و روزہ
شرع کی حد میں کھلتا رکھتی ماتھا موزہ

جب کہ شاؔد عارفی کی شاعری کا اصل جوہر عموماً ایسی نظموں میں زیادہ کھل کر سامنے آتا ہے۔

اے شاؔد آج صبح زمانے کے واسطے
پروا سنک رہی تھی سلانے کے واسطے
یہ نظم آئی مجھ کو جگانے کے واسطے
چادر نسیم منظر فطرت نے کھینچ لی
آنکھوں سے نیند میر کی عادت نے کھینچ لی

PDF Compressor Free Version



بستر چھا سمٹ کے اٹھانے کے واسطے

(دسہرا الشان)

''لگانے والے'' بنا کے باتیں، لگی ہوئی کو بجھا رہے ہیں
دھویں کے بادل، افق کے ماتھے ''کلنک ٹیکے'' سجا رہے ہیں
شفق کی سرخی مگر بتاتی ہے ''طور لاوا اگل رہا ہے''
ابھی جبل پور جل رہا ہے

(ابھی جبل پور جل رہا ہے)

ابھی ''جبل پور جل رہا ہے'' متعلقہ حالات کے تناظر میں ایک جبل پور پر کیا موقوف بھاگلپور تا مراد آباد اور نیلی تا گجرات اپنے دامن میں خونچکان داستان سمیٹے ہے۔

اس مجموعہ میں جہاں سے غزلوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اس کے ٹھیک پہلے صفحہ پر فرمان فتح پوری کا یہ جملہ آئینہ دکھاتا ہے:

''مجھے اردو غزل کی پوری تاریخ میں صرف دو ہی ایسے نام نظر آتے ہیں جن کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے غزل سے بامقصد اور سنجیدہ طنز نگاری کا بھرپور کام لیا ہے۔ میری مراد مرزا نوشہ اسد اللہ خاں غالبؔ اور شادؔ عارفی سے ہے۔ شادؔ عارفی کے طنز کا دائرہ انداز نظر اور موضوع ہر اعتبار سے غالبؔ کے مقابلے میں وسیع، بامقصد اور بہت واضح ہے۔'' (ص ۱۹۶)

اس میں شک نہیں کہ شادؔ عارفی کی شاعری بڑی متنوع اور ہمہ گیر ہے۔ وہ موضوعات کے ذہنی اور الفاظ و محاورات کے جادوگر ہیں۔ اب جو ان کا تازہ انتخاب کلام سامنے آیا ہے اس کے پیش نظر ان کی شاعری کے مجلّی امتیازات، ان کی بلندی و پستی، معیار و اقدار اور افکار و خیالات کی انفرادیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، جس

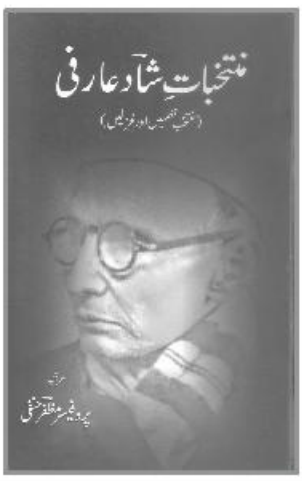


میں پروفیسر حنفی کے محولہ بالا اقتباسات کے دعوے کی صداقت بھی سامنے آئے گی اور اس کی روشنی میں شادؔ عارفی کے کلام کی حقیقت سے بھی ہم روشناس ہوں گے۔ شادؔ کی شاعری کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ ان کے فکری و فنی ڈانڈے کہاں کہاں اور کس کس شاعر سے ملتے ہیں، جن کے متعلق بقول پروفیسر مظفر حنفی، غالبؔ، حسرتؔ، آتشؔ، اکبرؔ، نظیرؔ، انیسؔ، اقبالؔ، جوشؔ اور یگانہ چنگیزی کے ساتھ ''عارفی کو'' گنتی کے چند بڑے اور ممتاز فنکاروں کی صف میں جگہ دینی ہوگی جن کی تعداد دس پندرہ سے زیادہ نہیں۔

یہ بات بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ شادؔ عارفی نے طویل اور مختصر دونوں بحروں میں اپنے فن کا جوہر دکھایا ہے، ان کے یہاں استادانہ پختگی بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ کلاسیکی روایات کے ساتھ جدید میلانات پر بھی ان کی نگاہ گہری ہے۔ ان کا یہ بھی ایک طرہ امتیاز ہے کہ وہ ہر طرح کے خیال اور موضوع کو شعر کا جامہ پہنانے پر قدرت رکھتے ہیں جسے ان کے جمہوری سروکار کا نام دیا جاتا ہے، لیکن شاعری محض جذبات و احساسات کا برجستہ اظہار یا قافیہ بندی نہیں بلکہ رفعت خیال اور احساس جمال کے ساتھ معنی آفرینی کا بھی نام ہے۔ ❁❁

| | | | |
|---|---|---|---|
| نام کتاب | : | تشکیلات | |
| شاعر | : | کلیم اختر | مرتب : ڈاکٹر نعیم صبا |
| اشاعت | : | ۲۰۱۵ء (ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی) | |
| صفحات | : | ۱۹۶ | قیمت : ۲۵۰ روپے |
| مبصر | : | ابرار احمد اجراوی | |

کلیم اختر معاصر غزلیہ کائنات کا مشہور نام ہے۔ ۲۰۰۷ء میں ان کا پہلا شعری مجموعہ ''خیال آب'' شائع ہوا تھا اور ان کا یہ دوسرا شعری مجموعہ اگرچہ آٹھ سال کے بعد اشاعت پذیر ہوا ہے، مگر یہ مجموعہ بتا رہا ہے کہ انہوں نے نئی شعری لفظیات کی توضیع اور نئی تراکیب شعری کی ایجاد، نئی تشبیہوں اور نئے تلازموں کی تلاش و پیش کش اور تغزل کے پیرایے میں فکر و جذبے کی فراوانی کے سبب شعری دنیا میں اپنی شناخت مستحکم کر لی ہے۔

PDF Compressor Free Version



زیر تبصرہ شعری مجموعہ کے آغاز میں عصر حاضر کے نامور اور ممتاز ناقدین کی تحریریں شاعر موصوف کی شعری صلاحیتوں کا شناخت نامہ ہیں۔ پروفیسر علیم اللہ حالی، ڈاکٹر اعجاز علی ارشد، ڈاکٹر محمد مقیم رضوی، فرحت قادری، مظفر اعجاز، شمس الرحمٰن فاروقی، وہاب اشرفی وغیرہ اعلیٰ پایہ کے ادیبوں کی تنقیدی آرا ان کی شعر گوئی کی صلاحیت اور ان کی معنی آفرینی کی بے پناہی پر دال ہیں۔ محفل شعر و سخن میں یہ مجموعہ ان کی دوسری آمد ہے۔ جناب کلیم اختر اگرچہ عمر کے لحاظ سے کہنہ سال نہیں، مگر اپنی ذہنی پختگی، الفاظ و تراکیب کو نیا رنگ و آہنگ عطا کرنے کی وہبی صلاحیت، گم شدہ لفظوں کی تلاش اور اردو کے سرمایے میں الفاظ و تراکیب کے اضافے کی وجہ سے شعری دنیا میں خاصی شہرت رکھتے ہیں۔ وہ اب تک کئی انعام و اعزاز سے بھی سرفراز ہو چکے ہیں۔ ان کا پیشہ درس و تدریس ہے اور زلف سخن کی مشاطگی ان کا ذہنی اور فکری محبوب مشغلہ۔

"تشکیلات" کا شاعر روایات و رسوم کا مقلد نہیں، یہ قابل رشک امر ہے کہ وہ خواہ الفاظ کی سطح پر ہو یا معنی کی سطح پر، عموماً پرانے اور فرسودہ راستوں پر چلنا گوارہ نہیں کرتے، بلکہ شاعری کی سرزمین پر نئے الفاظ و تراکیب کی فصل اُگانا پسند کرتے ہیں۔ ان کی تخلیقی روش میں ایک قسم کا انحراف و فرار ہے کہ وہ اسلاف و اکابر شعرا کے تتبع کے بجائے ایک آزاد تخلیقی فضا کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا یقین اس بات پر ہے کہ۔

نئی ردیف، نئے قافیے، نئے الفاظ
جدید ذہن کو ترکیب چاہیے کچھ اور

زیر نظر مجموعہ کی بیش تر غزلوں کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مضمون خواہ کتنا ہی اعلیٰ و ارفع ہو، وہ سہل، سلیس اور رواں الفاظ کا انتخاب کرتے ہیں۔ انداز بیان بھی صاف اور شستہ ہے۔ ان کی گرفت میں عصر حاضر کے بیش از بیش مضامین و موضوعات ہیں، ان مضامین کو برتنے کا انداز منفرد اور جدا ہے۔ موجودہ زمانے کی بے حیائی، فحاشی، عریانیت اور فیشن پرستی پر نئی نسل کے ہر شاعر نے طنز کیا ہے، مگر کلیم اختر کے طنزیہ رویے میں ایک قسم کی جدت ہے، جو تفکر و تحیر سے مملو ہے۔ انہوں نے عصر حاضر کی بے حیائی پر بڑا تیکھا شاعرانہ طنز کیا ہے، ترکیب بھی نئی ہے اور اس کے معانی و مفاہیم کی بھی کوئی سرحد نہیں ہے۔ لفظوں کی توڑ پھوڑ سے ہی نئی شعری لفظیات بر آمد ہوتی ہیں۔ زمانے کی ساری بے حیائی، بدعنوانی اور شکست و ریخت اس شعر کے دامن میں سمٹ آئی ہے۔

ضرورت پھر ہے "پوشاک حیا" کی
ہمارا عہد ننگا ہوگیا ہے

جہاں انھوں نے آشوب زمانہ، سیاست اور سماج کی کربناکیوں، انسانی بے چینی و بے کلی اور معاشرے کی بدلتی تصویر اور روایتی اقدار و معیار کی شکست کا نوحہ کیا ہے، وہیں وہ قاری کی تشنگی کی تسکین کے لیے عشق و رومان کی فضا میں بھی سانس لیتے نظر آتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ان کا یہ عشق و رومان محض روایتی نہیں بلکہ اس میں بھی کسی نہ کسی کربناک حقیقت کا تخلیقی اظہار کیا گیا ہے۔ دیکھیے رومان پرور فضا میں گشت کرنے والے یہ اشعار۔

انجم تھے، چاندنی تھے کہ بدر و ہلال تھے
کس کس ادا میں آپ تھے شب بھر پتہ نہیں
لچک کے رہ گئی ہے شاخ گل تبسم کی
ہنوز بند کلی ہوں ، گلاب لکھنے آ

خط لفافہ دیکھ کر پہچان لیا جاتا ہے۔ یہ شعری مجموعہ اپنے نام سے ہی یہ پتہ دیتا ہے کہ شاعر نے اپنے ذہن و دماغ کے سارے دریچوں کو کھلا رکھا ہے۔ نئے الفاظ اور نئی تراکیب وضع کرنا اس کا شیوہ ہے۔ وہ کسی بندھی ٹکی راہ پر چلنے کو رضامند نہیں، مگر وہ مشاہیر کے لہجے، استادان ادب کی تشبیہات و استعارات اور ان کی لے اور نے سے بھی آشنا ہیں اور وہ بخوبی جانتے ہیں کہ اساتذہ کے دواوین کا مطالعہ و محاکمہ کیے بغیر بڑی شاعری کے وجود میں آنے کا امکان معدوم ہو جاتا ہے۔ کلام متقدمین کا مطالعہ کوئی معیوب اور قابل گرفت بات بھی نہیں بلکہ یہ ایک اہم وظیفہ ہے، کیوں کہ اسی سے اردو کی شعری

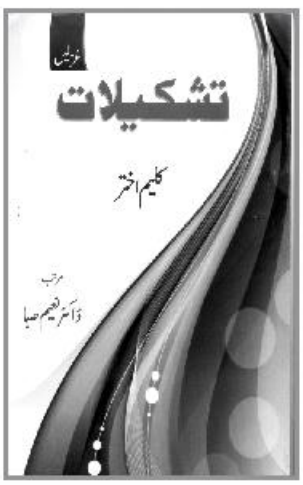

PDF Compressor Free Version



روایت کی توسیع وتفریح ہوتی ہے اور کلاسیکل اور جدید شعری روایات کے درمیان اتصال و ارتباط کی پو پھوٹتی ہے۔ انھوں نے کلاسیکی شعری روایات کا تتبع کرنے اور پیش رو شعرا کا نقش قدم ٹٹولنے کی کوشش کی ہے، جس میں توارد و توافق کا گمان بھی ہوسکتا ہے۔ مضامین پر پیش رو شعرا کا عکس ہے ہی، زمین بھی استاد شعرا کی ہے، مگر یہ مشابہت کسی ژولیدگی، تعقید یا ابہام کا سبب نہیں بنتی۔ ان کی زمینوں پر غالبؔ سے تاثر صاف جھلکتا ہے، مگر یہ کسی الجھن کا سبب نہیں، شمس الرحمٰن فاروقی نے صحیح لکھا ہے:

> ''اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ آپ غالبؔ سے براہ راست متاثر ہیں اور یہ بھی نہیں کہ آپ میں اور غالبؔ میں کچھ واضح مشابہتیں ہیں۔ بس بات یہ ہے کہ آپ کے یہاں جگہ جگہ فکر کا عنصر نظر آتا ہے جو آپ کی شاعری کو ایک امتیاز بخش دیتا ہے۔''

مجموعی طور پر ''تشکیلات'' کے اشعار ہمیں نئی عصری حسیت اور نئے شعری تلازموں کا پتہ دیتے ہیں اور نئی نسل کے شعرا میں کلیم اختر کو انفراد و امتیاز عطا کرتے ہیں۔ اشعار کی گوناگوں نزاکتوں کا کیا کہنا، یہ ایک مشکل عمل ہے۔ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ شاعر کے یہاں کہیں الفاظ کا انتخاب بہتر ہوتا ہے تو معانی کا تجربے کراں نظروں سے اوجھل ہوجاتا ہے اور کہیں اس کے برعکس صورت حال ہوجاتی ہے۔ کلیم اختر نے ہر جگہ لفظ و معنی کا ارتباط قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ بیشک ہر جگہ الفاظ و معانی کا حسین اتصال بڑا مشکل کام ہے اور یہ مشکل کام کلیم اختر نے کامیابی کے ساتھ انجام دیا ہے۔ پروفیسر علیم اللہ حالی نے بڑی اچھی بات لکھی ہے:

> ''اچھے مجموعہ کلام کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ اس میں اوسط یا کم درجے کے اشعار نہ ہوں بلکہ فن کار کا قد اس کے بلند تر اشعار سے ناپا جاتا ہے۔ کلیم اختر کے یہاں ایسے متعدد اشعار ہیں جو ان کی وقعت میں اضافہ کرتے ہیں اور ہم عصر اردو غزل میں ان کے باوقار وجود کا اثبات کرتے ہیں۔'' (''تشکیلات'' ص ۱۵)

کلیم اختر کا امتیاز یہی ہے کہ انھوں نے اپنے زرخیز ذہن سے کام لے کر اردو کی نئی شبدا ولی تیار کرنے کی جرأت کی ہے جو قابل رشک بھی ہے اور حیرت انگیز بھی۔ وہ اپنی منفرد تشبیہوں، نادر فقروں، معنی خیز تلمیحوں، نئے شعری تلازموں اور نئے استعاروں کی تخلیق کا ہنر جانتے ہیں۔ ہنتاب، قوساب، تلخاب، شورستان، تلخایا، خیال زار، غم ساز، گناہیت، گلانسو، زہریز، زنگیلے، لفظایا، زہرایا، نقشایا، شعلات، طلسمتان، شورستان، خیالستان اور طلسم ریز وغیرہ ایسے مرکب الفاظ ہیں، جو اردو کے قاری کے لیے نامانوس ہیں، مگر ان سے روایت سے بغاوت کی عکاسی ہوتی ہے اور روایت سے انحراف کوئی معیوب اور قابل گردن زدنی عمل نہیں کہ یہی انحرافی رویہ شعر و شاعری کی زمین میں نئی فصل اگاتا ہے۔ کتاب کا ٹائٹل دیدہ زیب اور سرورق پرکشش ہے، مگر میری رائے میں تشکیلات جیسے نام سے شعریت کی بو نہیں آتی، یہ تنقیدی کتاب کے لیے تو بہتر نام ہوسکتا ہے، عشق و رومان سے آمیز شعری مجموعے کے لیے نہیں۔ امید ہے کہ ان کے پہلے شعری مجموعے کی طرح ادبی حلقوں میں اس کی بھی پذیرائی ہوگی۔ ❁❁

| | | | |
|---|---|---|---|
| نام کتاب | : | دہلیز | |
| مصنفہ | : | ڈاکٹر نرگس جہاں باروی (ایڈوکیٹ) | |
| ناشر | : | مصنفہ ڈاکٹر نرگس جہاں باروی (ایڈوکیٹ) | |
| اشاعت | : | ۲۰۱۶ء | |
| صفحات | : | ۱۰۸ | قیمت : ۱۵۰ روپے |
| مبصر | : | کہکشاں توحید | |

میں نرگس جہاں باروی کی ''دہلیز'' پہ کھڑی ہوں۔ کیا کروں باہر سے ہی ان کی ''دہلیز'' کا معائنہ کروں یا اندر داخل ہوکر دیکھوں کہ اس دہلیز کے اندر کیا کیا حادثات رونما ہو رہے ہیں اور انہوں نے ''دہلیز'' کی آن اور شان کو کس طرح برقرار رکھا ہے؟

فکشن کی دنیا میں نرگس جہاں کا نام کوئی اجنبی نہیں۔ نرگس جہاں باروی کو شروع سے ہی کہانیاں لکھنے کا شوق رہا ہے۔ گھر میں ادبی ماحول اور خاندانی حیثیت ہونے کی وجہ کر ادبی کتب کا ذخیرہ موجود تھا ہر سمت ہر اطراف کتابیں ہی کتابیں تھیں، چنانچہ ابتدا سے ہی ان کے

PDF Compressor Free Version



شوق نے انہیں اور بھی آگے بڑھانے میں ساتھ دیا اور ان کی نگارشات اشاعت بھی پانے لگیں اور ریڈیو سے نشر بھی ہونے لگیں۔

نرگس جہاں کی پیش نظر کتاب ''دہلیز'' میں کل بارہ افسانے ہیں اور کتاب کے تعلق سے علیم اللہ حالی، ڈاکٹر قیصر زاہدی، ڈاکٹر نو رالہدیٰ شمسی کی تحریریں بھی شامل ہیں۔ سبھوں نے ان کے افسانوں کو سراہا اور کامیاب بتایا ہے۔ میں نے ان کے افسانوں کا مشاہدہ کیا تو اس میں سماج کے ٹھیکیداروں کی بے وفائی نظر آئی۔ مرد بھائی کی شکل میں ہو، بیٹے کی شکل میں یا شوہر کی شکل میں، سبھوں نے عورت کی معصومیت کا فائدہ اٹھایا ہے اور اس کی زندگی میں زہر گھولنے کی کوشش کی ہے۔ نرگس جہاں مردوں کے لئے پیار کے جذبات اپنے کرداروں کے ذریعہ دکھاتی ہیں، لیکن وہ مرد اتنا بے وفا اور سنگ دل ہے کہ اسے کچھ بھی احساس نہیں ہوتا۔ شاعر نے شاید ایسے ہی مردوں کے لئے کہا ہوگا کہ ع

لوگ عورت کو فقط ایک جسم سمجھ لیتے ہیں

نرگس جہاں کے کردار بے حد خوددار ہیں۔ وہ ٹوٹ سکتے ہیں، جھک نہیں سکتے۔ ''شکستہ دل'' کی ثمینہ اپنے شوہر کی بے وفائی برداشت نہیں کر سکتی اور وہ اسے چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے چلی جاتی ہے۔

''شہر داماں'' میں بھی مرد نے بے وفائی کی۔ وہ شنو جس نے اپنے شوہر کو شہر بھیج کر زندگی کو ایک سرا دلایا، زندگی کے معنی سمجھائے وہ وہاں جا کر اسے ہی فراموش کر بیٹھا اور وہاں کی ہی ایک پڑھی لکھی اور خوبصورت لڑکی سے شادی کر لی۔

غرض کہ نرگس جہاں نے سماج کی بے راہ روی پر اپنے افسانوں میں گہرا طنز کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے اور بھی افسانے یاسیت سے قریب ہیں'' ممتا کی زنجیر'' میں بھی ایک ماں کو اس کے بیٹے سے بے پناہ درد ملتا ہے اور وہ ٹوٹ جاتی ہے۔ وہ سسرال والوں کی بے وفائی کے ساتھ اپنے جگر کے ٹکڑے کی بے بسی برداشت نہیں کر سکتی اور اپنے گھر کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔

نرگس جہاں اپنی کہانیوں کی وساطت سے دنیا کے ساتھ ساتھ دین کی بھی حفاظت کرنا چاہتی ہیں۔ لڑکیوں کا بہت زیادہ آزاد ہونا بھی انہیں ناپسند ہے۔ نرگس جہاں کے افسانوں میں بلا کی کشش ہے اور

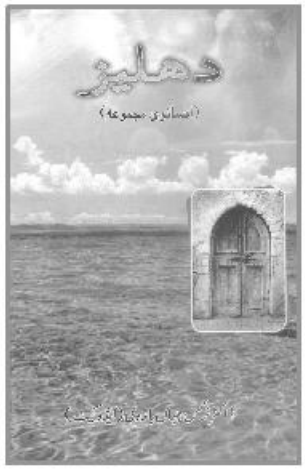


قاری کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ واقعی افسانے میں دکھائے گئے ماحول میں پہنچ گیا ہے اور اپنی نظروں کے سامنے سارے مناظر کو ہوتے دیکھ رہا ہے یہ گویا قاری کو ناظر کی صف میں لا بیٹھانے کا فن ہے جو بہت شاذ و نادر ہے۔ اس مجموعے میں ٹائٹل کہانی سے ''اونچے لوگ تک'' بارہ افسانے ہیں اور ان میں کچھ افسانے جیسے ''اجنبی''، ''دھنک کے رنگ'' بھی خوبصورت افسانوں کی فہرست میں آتے ہیں ''شامت جو آئی'' مزاحیہ افسانہ ہے جو سیاست سے بھرے ماحول کو چند پل کے لئے خوشگواری میں بدل دیتا ہے۔

کامیاب افسانے وہی ہیں، جس کی اثر آفرینی تا دیر قائم رہے اور نرگس جہاں کے افسانوں میں یہ وصف بہ بدرجہ اتم موجود ہے۔ ''اونچے لوگ'' میں بھی معاشرے کا درد محسوس ہوتا ہے کہ بڑے لوگ کس طرح غریبوں کا استحصال کرتے ہیں۔ نرگس کے افسانے میں منظر نگاری کا حسن بھی دیکھنے کو ملتا ہے اور قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ گویا اس فضا میں کھو گیا ہے۔

نرگس جہاں کے قلم میں جادو ہے اور اس جادوئی قلم کی ''دہلیز'' یقیناً پڑھنے والوں کو اپنی طرف بلا لیتی ہے۔ یہ ان کا پہلا مجموعہ ہے، لیکن بہت ہی کامیاب۔ ہمارے اردگرد سماج کی جو کارگزاریاں ہیں وہ ان کی کہانیوں میں ہمیں صاف صاف فکری وفنی اور تجزیاتی لوازمات کے ساتھ ملتی ہیں۔ یہ درست ہے کہ کتاب کی تصحیح کا پورا حق ادا نہیں ہو سکا، مگر اس کے باوجود یہ مجموعہ ہر لحاظ سے پسندیدہ ہے۔ ڈاکٹر نرگس جہاں نے بہر حال اپنی ''دہلیز'' کی آن بان اور شان پوری طرح قائم رکھی ہے۔ خدا کرے آنے والے دنوں میں وہ اس سے بھی کچھ زیادہ کامیابی کی راہیں طے کریں۔

PDF Compressor Free Version



ہماری سرگرمیاں

# ''اکادمی آپ تک'' پروگرام کے تحت مظفر پور میں ارباب علم وادب کی قدر افزائی

پٹنہ: بہار اردو اکادمی کے مسلسل اور مقبول ترین پروگرام ''اکادمی آپ تک'' کے انعقاد کا سلسلہ مختلف شہروں میں جاری ہے۔ جنوبی اور شمالی بہار کے مختلف شہروں مثلاً گیا اور دربھنگہ، بتیا، بیگوسرائے وغیرہ میں اس پروگرام کی کامیابی کے بعد گزشتہ ۱۶ر جولائی کو مظفر پور میں ''اکادمی آپ تک'' کے تحت ارباب علم و قلم کو اعزازات سے نوازا گیا۔ عابدہ ہائی اسکول، چندوارہ پکی سرائے کے مولانا ابوالکلام آزاد ہال میں ہونے والی اس تقریب میں مہمانان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر اعجاز علی ارشد وائس چانسلر مولانا مظہر الحق عربی و فارسی یونیورسٹی، جناب اختر الاسلام شاہین ایم۔ ایل۔ اے سمستی پور اور جناب سید ماجد حسین ڈپٹی میئر مظفر پور نے شرکت کی۔ اس موقع پر مہمانان خصوصی کے دست مبارک سے پروفیسر سید نجم الہدیٰ، پروفیسر خورشید سمیع اور پروفیسر ناز قادری کی خدمت میں ان کی مجموعی علمی وادبی خدمات کے لئے توصیفی سند، اعزازی رقومات، مومنٹو اور شال پیش کر کے ان کی قدر افزائی کی گئی، چونکہ پروفیسر ناز قادری اپنی بیماری کے سبب پروگرام میں تشریف نہیں لا سکے اس لئے انہیں ان کے گھر جا کر اکادمی کے سکریٹری اور دیگر معززین نے سند، مومنٹو، رقم کے ساتھ شال پوشی کی۔ اس تقریب کی صدارت پروفیسر اعجاز علی ارشد نے فرمائی۔ اس موقع پر سکریٹری اکادمی مشتاق احمد نوری نے اپنے مختصر خطبہ استقبالیہ میں کہا کہ آج کی یہ محفل، اکادمی کی فعالیت اور خوش قسمتی کا یادگار اور تازہ ثبوت ہے۔ اکادمی مظفر پور کے اہل علم و دانش کو نواز کر دراصل اپنا وقار بلند کر رہی ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ یہ پروگرام بہار کے ہر ضلع میں ہوگا اور وہاں کے ادیبوں کی پذیرائی کی جائے گی۔

پروفیسر منظر اعجاز نے پروفیسر سید نجم الہدیٰ کی طویل علمی و تدریسی اور ادبی خدمات کے مختلف پہلوؤں پر اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر موصوف ہمارے ان بزرگوں میں ہیں جن کے کارناموں سے تادیر، جنوبی ہند والے مستفید ہوتے رہے ہیں اور وہ اس کے معترف بھی ہیں۔ پروفیسر فاروق احمد صدیقی نے بھی اپنی تقریر میں پروفیسر سید نجم الہدیٰ کی علمی شخصیت کے مختلف پہلو اجاگر کئے اور کہا کہ ان کی حیثیت استاد الاساتذہ کی ہے۔ پروفیسر خورشید سمیع کے ہمہ جہت علمی کارناموں کا جائزہ لیتے ہوئے جناب حسن رضا نے کہا کہ بلاشبہ علم کیمیا کے ایک استاد نے اردو تنقید نگاری کی دنیا میں اپنی مثالی خدمتوں سے زمانے کو معترف بنا رکھا ہے۔ ڈاکٹر جلال اصغری فریدی نے پروفیسر خورشید سمیع کی شخصیت، ان کے انتقادی نظریے اور تجزیاتی طریق کار سے متعلق کئی اہم نکات پیش کئے۔ پروفیسر ناز قادری کی علمی وادبی فتوحات پر جناب صفدر امام قادری نے اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ انہوں نے نہ صرف شاعری میں بلکہ فکشن اور تنقید میں بھی اپنی معیاری خدمات سے اردو ادب کو نوازا ہے۔ پروفیسر عظیم الرحمٰن سابق پرنسپل ایل۔ ایس کالج مظفر پور نے بھی اپنی تقریر میں پروفیسر ناز قادری کی شخصیت کے مختلف گوشے اجاگر کئے۔ اس موقع پر پروفیسر اعجاز علی ارشد نے کہا کہ بہار اردو اکادمی کا یہ پروگرام دنیا بھر میں مقبول ہوا ہے۔ یہ ایک بڑی بات ہے کہ اکادمی گھر تک آ کر ادیبوں کی پذیرائی کر رہی ہے۔ سمستی پور کے ایم۔ ایل۔ اے اختر الاسلام شاہین نے کہا کہ وہ اکادمی کی اس ادبی محفل میں آ کر بے حد خوشی محسوس کر رہے ہیں اور ادیبوں کی حوصلہ افزائی دیکھ کر انہیں بے حد مسرت ہو رہی ہے۔ انہوں نے سمستی پور بھی آنے کی دعوت دی جسے سکریٹری مشتاق احمد نوری نے منظور کرتے ہوئے کہا کہ انشاء اللہ آئندہ پروگرام وہیں ہوگا۔ مظفر پور کے ڈپٹی میئر نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ مظفر پور ضلع کے ادیبوں کی پذیرائی کو وہ پورے ضلع کی پذیرائی تصور کرتے ہیں۔ انہوں نے اکادمی کے کاموں کی تعریف کرتے ہوئے کہا کی موجودہ سکریٹری کی فعالیت کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

وقفہ طعام کے بعد پروفیسر عظیم الرحمٰن کی صدارت میں مقامی شعرا پر مشتمل ایک مشاعرے کا انعقاد ہوا جس میں، جناب اسعد رضوی، جناب تعظیم احمد گوہر، ڈاکٹر آرتی کماری، ڈاکٹر بھاونا، جناب حسنین اختر اور جناب محفوظ عارف کے علاوہ ڈاکٹر جلال اصغر فریدی، جناب رضوان علی نقوی، جناب رومان رضوی اور جناب سید ریاض احمد نے اپنے کلام سے سامعین کو نوازا۔ سکریٹری اکادمی کی شکریہ کی تجویز پر تقریب کا اختتام ہوا۔

PDF Compressor Free Version



# سلام و پیام

☆ ''زبان وادب'' کے جون ماہ کا شمارہ دیدہ زیب وجاذب نظر سرورق اور شہرۂ آفاق ادیب محقق و ناقد جناب شکیل الرحمٰن کے گوشے کے ساتھ باصرہ نواز ہوا۔ شکیل صاحب سے وابستہ مضامین برمحل و بہ موقع ہیں۔ ان کا اپنا مقالہ زیرعنوان ''جمالیات'' میں موضوع کی اصطلاح کی وضاحت وحوالات کی موزونیت دیکھتے ہی بنتی ہے۔ فقط اس فقرے میں ''معنی'' لفظ کے بعد ''خیز'' لفظ مفقود لگتا ہے: ''جمالیات کی اصطلاح ایک انتہائی معنی (خیز) غیر معمولی اصطلاح ہے۔'' (ص ۵۶) بالخصوص یہ مقولہ قابل غور وخوض ہے: ''ہر اچھی اور بڑی تخلیق جمالیاتی ہوتی ہے۔'' (ص ۵۷) اس کی تصدیق ان کی بے بہا تصانیف وافکار کی فہرست سے ہوتی ہے۔ پروفیسر شاہین کا مضمون جناب شکیل کی تنقیدی کتاب ''اختر الایمان: جمالیاتی لیجینڈ'' کے توسط سے تحریر کردہ تو ضرور ہے، لیکن اس امر کا ذکر ابتدا میں ہی ناگزیر تھا۔ یہ مقولہ قابل مدح ہے کہ موصوف کی ''تنقید میں بھی وہی جمالیاتی احساس موجود ہے، جو شاعر کے کلام کا خاصہ ہے۔'' (ص ۴۴) بطور شاعر اختر الایمان ''غزل'' موسومہ صنف شاعری کے مخالف تھے اور ان کا یہ مستحکم خیال تھا کہ اس میں مواوی زمین کی تنگی کے موجب موضوعات کے تنوع کی کمیابی رہتی ہے۔ اس مقالے میں جو تمام تر اقتباسات محولہ ہیں، وہ شکیل، اختر واز خود شہناز کے ذوق سلیم کے بھی شواہد ثابت ہوتے ہیں۔ کہکشاں تبسم نے شکیل صاحب کی سوانح حیات ''آشرم'' کی بابت یہ صحیح درج کیا ہے کہ یہ بات استعجاب آمیز ہے کہ ''اتنی عمدہ اور دلکش نثر کا خالق ایک نقاد ہے'' مزید ان کا یہ کہنا بھی مناسب ہے کہ سوانح حیات ''نثری بیانیہ اور شاعرانہ رمز'' (ص ۳۹) کا حسین امتزاج ہے۔ مضمون نگارہ نے اس مقالے میں از خود شعری نثر کا استعمال کر کے گویا ہر قاری کو نادانستہ اپنا گرویدہ بنانے کی ایک لاشعوری سعی کی ہے۔ ایک جگہ یہ فقرہ غلط شائع ہوا ہے۔ ''جگر لوں کیا ہے'' (ص ۴۰) یہاں ''جگہ یوں'' الفاظ درکار تھے۔ مسرت جان نے علامہ اقبال کی شاعری کے تناظر میں ان کا اور شکیل صاحب کا جو تنقیدی وتحقیقی موازنہ کیا ہے، وہ مضمون کے انتخاب سے لے کر اس کی پیش کاری تک ان ہی کا حصہ ہو سکتا تھا۔ انہوں نے شکیل الرحمٰن کی کتاب ''روشنی کی جمالیات'' کا بار بار حوالہ دیا ہے۔ اس کا اور ڈاکٹر شیخ عقیل محمد کی کتاب ''ادب اور جمالیات'' کا کوئی بھی ذکر تصانیف کی فہرست میں ص ۹ پر کیوں نہیں کیا گیا ہے؟ عربی زبان کا ایک لفظ ''زائیدہ'' (ص ۴۷) مذکر اسم ہے، موئث نہیں، لہٰذا ''کی زائیدہ معلوم ہوتی ہے'' کی بجائے ''کا زایدہ معلوم ہوتا ہے'' لکھنا ہی درست تصرف تھا۔ کلی طور پر یہ شمارہ بھی حسب معمول معیاری و بلند پایہ مضامین سے مملو ہی گردانا جائے گا۔

کرشن بھاؤک، پنجاب

☆ ''زبان وادب'' مئی ۲۰۱۶ء کے شمارے میں چھ مشاہیر ادب کی وفات پر میرے قطعات تاریخ آئے ہیں، جن میں منیر سیفی صاحب نے کچھ کو تاہیوں کی نشاندہی کی ہے، اس سلسلے میں صراحت ذیل پیش ہے:

اعتراض (۱) جواب: دراصل یہ ''بہ حکم الٰہی'' نہیں بلکہ ''بحکم الٰہی'' ہے، جس کا عدد 631 ہی ہے۔ اس صفائی سے اعتراض (۲) بھی ختم ہو جاتا ہے۔ مصرع اول 631 مصرع ثانی 1385 = 2016

اعتراض (۳) کہانی کار بھی اب ہائے انتظار حسین جواب: ''بھی'' نہیں ہے، ''جو'' ہے، اس لئے 2016 صحیح ہے۔ اعتراض (۴) لو کہانی کار دنیا سے اب اک اٹھ گیا۔ جواب: برآمد شدہ اعداد 644 ہی ہیں جو منیر سیفی بھی بتاتے ہیں۔ 643 جوڑنے کی غلطی ہے۔

اعتراض (۵) جواب: آبروئے فن افسانہ نثری جوگندر پال (بغیر ہمزہ کے ہے) 1372=826/197/130/219 میں نے جوگندر بغیر ''ی'' لیا ہے۔ اس لئے 644 + 1372 = 2016

(پروفیسر) عبدالمنان طرزی، دربھنگہ

☆ ''زبان وادب'' کا تازہ شمارہ (۳۷/۷) ملا۔ آپ نے جوگندپال کی یاد میں دو چار ہی مضمون شامل کیا ہے، مگر سبھی تحریریں گویا اپنے موضوع پر انتخاب ہیں اور پھر اداریے میں اسی خاص موضوع کو لے کر آپ نے

PDF Compressor Free Version



جوگندر پال کی یادوں کے تعلق سے شاید وہ سب لکھ دیا ہے جو اس طرح کسی دوسرے کے لئے لکھنا مشکل تھا۔ ایک تو یہ کہ یادوں سے لکھنے والوں کا شخصی رشتہ ہوتا ہے اور دوسرے یہ کہ انہیں پیش کرنے کا انداز بھی، یادنگار کا اپنا انداز ہوتا ہے جس میں اس کے جذبے گھلے ملے ہوتے ہیں۔ آپ نے بالکل درست لکھا ہے کہ ''جوگندر پال جیسی عظیم شخصیت کبھی کبھار ہی پیدا ہوتی ہے، لیکن اردو والوں کی بدقسمتی یہ ہے کہ ایسی شخصیت کی پزیرائی نہیں کر سکتے۔ یہ ایک کڑوا سچ ہے کہ اردو والوں نے جوگندر پال کی وہ پزیرائی نہیں کی جو ان کا حصہ تھا۔'' خدا کرے، دیر سویر ہی سہی، جوگندر پال پر مکمل نمبر نکالنے کی آپ کی کوشش بارآور ہو جائے۔ زیر نظر خاص گوشے کے لکھنے والوں کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اپنے موضوع سے انصاف کی راہ بھی نہیں چھوڑی ہے اور دوران تحریر بڑی خوبصورتی سے ایسا سوانحی مواد بھی شامل کر دیا ہے جس سے پال صاحب کی زندگی اور ادبی خدمات کے تاریخی حقائق سامنے آجاتے ہیں۔ یہ گوشہ جوگندر پال پر کام کرنے والوں کو اپنی دستاویزی اہمیت کا احساس دلاتا رہے گا۔ ''مقالات'' کے حصے میں ڈاکٹر نریش نے کرشن چندر کی جو یادیں تازہ کی ہیں اور جو باتیں لکھی ہیں وہ کرشن چندر کی نفسیات اور ان کے اندرونی معاشی احوال آئینہ کر دیتی ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ حساس ادیب کو شاید ہر دور میں ذاتی طور پر بھی بہت سارے خاموش کرب سے گزرنا پڑتا ہے۔ شہزاد معصومی پر ڈاکٹر محسن رضا رضوی کا مضمون بھی بہت ہی عمدہ ہے اور ڈاکٹر رضوان احمد اعجازی نے بھی ''کلام اقبال میں عورت'' کے موضوع پر بالکل نئے انداز سے لکھا ہے، اس موضوع پر یوں تو میں نے بہت سی چیزیں پڑھیں، لیکن اس طرح منطقی اور تجزیاتی انداز سے ہر ایک رخ کو جس طرح انہوں نے الگ الگ کر کے دکھایا ہے، وہ کیفیت اس سے پہلے مجھے کسی اور مضمون میں نہیں ملی تھی۔ یہ بھی اچھا لگا کہ مشہور اشعار کی کثرت سے انہوں نے مضمون کو بوجھل نہیں ہونے دیا ہے۔ افسانوی حصے میں ڈاکٹر قمبت نسیم کی کہانی ''کریلے'' ماں کی ممتا بھری نفسیات کو بالکل نئے انداز سے دکھاتی ہے۔ شاکر کریمی کا افسانہ ''زخم اور مرہم'' بڑے خوبصورت ڈھنگ میں نفسیاتی مغالطے کی چادر میں لپٹا ہوا ہے اور جب یہ ردا ہٹتی ہے تو صاف دیکھا جا سکتا ہے کہ کس طرح محبت کے زخم پر مرہم رکھنے کا سامان مہیا ہو جاتا ہے۔ راجہ یوسف کی کہانی ''مہمیز'' بھی کشمیر کے تناظر میں ایک اچھی کہانی ہے اور اسے ''مہمیز'' کا جو عنوان دیا گیا ہے، وہ بہت بامعنی ہے۔ یہاں کلائمکس کی فطری حیرت زائی برقرار رکھنے میں راجہ یوسف خوب کامیاب ہیں۔ نظموں اور غزلوں کا حصہ بھی کافی معیاری ہے۔ علیم صبا نویدی کی ''تین سطری نظمیں'' کیا ہیں، ایسا لگتا ہے کہ ہر تین سطر میں خیالات و حقائق، نصائح، احساس، جذبے اور مشاہدے کی ایک دنیا آباد ہے۔ تبسم فاطمہ کی نظم بھی عصری حسیت سے بھرپور اور پر اثر ہے۔ کتابوں پر تبصرے بھی بھرپور ہیں۔ ''بچوں کا زبان وادب'' بھی اچھی اچھی تحریروں سے آراستہ ہے۔

(ڈاکٹر) شائستہ انجم نوری، پٹنہ

☆ ''زبان وادب'' جولائی ۲۰۱۶ء بروقت دستیاب ہوا۔ آپ نے جب سے اکادمی کا چارج لیا ہے، ایسا لگتا ہے کہ آپ نے اس ادارہ کے اندر نئی روح پھونک دی ہے۔ یہ آپ کی فعالیت کا نتیجہ ہے۔ یہ اس لئے بھی ہے کیونکہ آپ اردو ادب کے ساتھ دل سے وابستہ ہیں۔ جوگندر پال پر چار مضامین ان کے افکار کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں۔ افسانہ ''غروب'' میں پال صاحب تحریر فرماتے ہیں۔ ''محبت علم نہیں ڈاکٹر، محبت احساس ہے، کیونکہ علم سب کی ساجھی ملکیت ہے اور محبت سب کی اپنی اپنی۔'' افسانہ کی کاریگری دراصل اس کے بیساختہ اور غیر رسمی کردار میں مضمر ہے'' (جوگندر پال: افسانے کی کاریگری) ''جوگندر پال ان ادیبوں میں سے ایک ہیں جن کی تحریروں میں سوچ کا عنصر روشنی کی درخشندہ گزرگاہوں کی طرح صاف نظر آتا ہے۔'' (وزیر آغا) ''جوگندر پال بلاشبہ اپنے عہد کے ایک ایسے جیالے اور پختہ کار افسانہ نگار ہیں جنہوں نے اپنی لازوال تخلیقات سے اردو افسانے اور ادب کو مالا مال کیا ہے۔'' (م۔م۔ راجندر) ''شہزاد معصومی کا شعری امتیاز'' ڈاکٹر محسن رضا رضوی کا لکھا ہوا مضمون بھی کافی اچھا ہے۔ تبسم فاطمہ کی نظم ''کہیں دبائی جا رہی ہے ایک چیخ.....'' بگڑتے ہوئے حالات سے پیدا ہونے والے درد کا نتیجہ ہے۔ بلاشبہ ہمارے سماج میں

PDF Compressor Free Version



کمزوروں پر ظلم ہوتا ہے جو بہت غلط ہے، مگر یہ ایک حقیقت ہے جس سے ہم انکار نہیں کر سکتے۔ تبسم فاطمہ کے دل پر فرقہ پرستی سے گہری چوٹ لگی ہے۔ یہ اپنی جگہ پر درست ہے اور سچ ہے، لیکن ہمارے اندر pessionism و منفیت نہیں ہونی چاہئے۔ ہندوستان کی سالمیت اور ترقی کے لئے Secularism کے سوا اور کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔

اختر حسین آفتاب، پٹنہ

☆ ''زبان وادب'' جولائی ۲۰۱۶ء کا شمارہ ملا۔ جوگندر پال کے سانحہ ارتحال کے بعد ان کی خوبیوں اور صلاحیتوں پر جن قلم کار حضرات نے اپنے دلی تاثرات کا اظہار اپنے مضامین میں کیا ہے وہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ وہ ہمیں کتنے عزیز تھے۔ ان کی وفات اردو دنیا کے لئے ایک عظیم نقصان ہے جس کی تلافی فی الوقت مشکل دکھائی دیتی ہے۔ شہزاد معصومی پر ڈاکٹر حسن رضا رضوی کا خاکہ مختصر ہی سہی مگر بہت خوب ہے۔ جناب شاکر کریمی نے افسانہ ''زخم اور مرہم'' میں بھائی بہن کے پاکیزہ رشتے اور ان کے درمیان گہری محبت کی جو خوبصورت تصویر بنائی ہے وہ قابل تحسین ہے۔ منظومات میں سلطان اختر کی غزلیں پسند آئیں خاص طور سے یہ شعر ۔

بہت حسیں تو نہیں منظر طلوع سحر
جو ہم کو خواب سے بیدار کر دیا گیا ہے

ان کے علاوہ دیگر مشمولات میں لائق توجہ ہیں، مگر جناب علیم صبا نویدی کی تین سطری نظمیں ادب کے کس خانے میں رکھی جائیں۔ شاعری میں نئے نئے تجربے ضرور کئے جا سکتے ہیں، مگر ادب کی روح کو مجروح کرنا مناسب نہیں۔ آپ کی مشمولیت کے بعد ''زبان وادب'' میں کافی تبدیلیاں نظر آ رہی ہیں اور اکادمی کی سرگرمیوں میں بھی اضافہ ہوا ہے، نئے اور پرانے لکھنے والوں کی ہمت افزائی اور قلم کاروں کے ساتھ مجابانہ روش کے علاوہ ان کی مالی معاونت بھی کی جا رہی ہے جو قابل تعریف بھی ہے۔ خدا کرے یہ عمل ہمیشہ جاری رہے۔

سلطان ساجد، ہاورہ

☆ ''زبان وادب'' ماہ جولائی ۲۰۱۶ء موصول ہوا، مگر اکھڑی اکھڑی جلد اور بکھرے صفحات کی حالت میں جس کے لئے جلد سازی پر توجہ کی ضرورت ہے۔ ''اداریہ'' پڑھ کر آپ کی قومی یادداشت کو سلام کرتا ہوں۔ پرانی باتیں آپ اس ہنرمندی سے بیان کرتے ہیں جیسے ابھی کل ہی کی بات ہو۔ زیر نظر شمارے میں اسلم راہی بھائی کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اسلم بھائی شاعر بھی عمدہ ہیں اور آدمی بھی اچھے ہیں۔ میں ان کے ساتھ سہسرام میں کئی نشستیں کر چکا ہوں، مشاعرہ پڑھ چکا ہوں۔ اسلم بھائی اس وقت بالکل اپنے والد ماجد کی طرح ہو گئے ہیں۔ اسلم بھائی کے والد بہت خوبصورت اور نفیس آدمی تھے۔ ان کے بات کرنے کا انداز بھی دلچسپ اور منفرد تھا۔ آپ جب محلہ بارہ دری سے پوسٹ آفس یا کچہری کے لئے نکلتے تو میرے محلہ کرن سرائے ہوتے ہوئے جاتے اور میرے والد مرحوم و مغفور مولوی عبدالوحید خاں شمسی کے پاس کم از کم ایک گھنٹہ ضرور تشریف رکھتے تھے۔ موصوف کو فارسی اشعار بہت یاد تھے۔ میں وہیں کھڑا کھڑا ان دونوں کی علمی گفتگو سنتا رہتا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد آ رہا ہے، میں ۱۳ جون ۲۰۱۶ء کے روزنامہ ''قومی تنظیم'' کے ادب ایڈیشن میں وہ مضمون پڑھ چکا ہوں جو صفحہ نمبر ۲۷ پر ''زبان وادب'' میں شائع ہوا ہے۔ زیر نظر شمارے میں ظفر کمالی صاحب کی نظم کافی اچھی لگی۔ شمارہ ہذا میں شامل دیگر تخلیقات بھی اچھی ہیں۔ قلم کاروں کی طرح، مکتوب نگاروں کی تصاویر بھی اگر شائع کی جائیں تو میں سمجھتا ہوں کوئی برا نہیں ہوگا۔

شکیل سہسرامی، پٹنہ

☆ امید کہ مزاج بخیر ہوں گے۔ ''زبان وادب'' (۳۷/۴) تاخیر سے ملا۔ آپ کی ذہانت، محنت، لگن اور مشقت رنگ لا رہی ہے اور پرچہ آپ کی سرپرستی میں تیزی سے ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہے۔ زیر نظر شمارہ کی بیشتر تخلیقات خوبصورت اور معیاری ہیں۔ نئے اور پرانے قلمکاروں کی شمولیت نے اس کے حسن میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔ ''حرف آغاز'' میں آپ نے درست فرمایا ہے کہ ''آج کل شہرت کی ہوا چلی ہوئی ہے اور آج فنکاروں کی جو نسل منظر عام پر آ رہی ہے اس کے نزدیک نہ تو بزرگوں کا احترام ضروری ہے اور نہ اس میں اخلاقی قدروں کی پاسداری پائی جاتی ہے۔ وہ اپنی تخلیقات میں نامانوس الفاظ کا استعمال، زبردستی نئی اور غلط تراکیب گڑھنا اپنی شان

PDF Compressor Free Version



سمجھتے ہیں۔" نثری حصہ میں مشرف عالم ذوقی، ہاجرہ خاتون، فرحت بانو، محمد امان اللہ، راحت افزا اور محمد عبداللہ کے مقالات عرق ریزی سے لکھے گئے ہیں اور جن مشاہیر فن کاروں پر قلم کاروں خامہ فرسائی کی ہے وہ لائق ستائش ہے۔ شفیع مشہدی، ڈاکٹر اختر آزاد اور شہیرہ مسرور کے افسانوں میں عصری کرب اور موجودہ انسانی مسائل کو خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر علی عباس امید اور جمال اویسی کی نظموں میں داخلی اور خارجی احساسات پوری طرح کارفرما ہیں، نظموں کا اسلوب بھی خوب ہے۔ علیم صبا نویدی، خورشید طلب، راشد جمال فاروقی، سہیل اختر، فراغ روہوی اور اشرف مولانگیری کی غزلوں میں الفاظ کی تازہ کاری کے ساتھ فکر کی گہرائی بھی ہے۔ گوشۂ ادب میں قیصر صدیقی سمستی پوری کی نظم "دعائے خیر" اپنی جانب متوجہ کرتی ہے۔ ان کے دو اشعار نے خاص طور سے متاثر کیا۔

یا اقبال کو پیدا کر یا مولانا حالی دے
سر کو بنا شبیر ادا دل کو سوز بلالی دے

ظفر سلطان اور درخشاں جبیں کی نثری تخلیقات فکر انگیز، پر مغز اور تاثیر سے پر ہیں۔ مختلف کتابوں پر ڈاکٹر نسیم اختر اور شوکت جمال کے تبصرے بھی پسند آئے۔ دو تین ماہ کے اندر برصغیر کی کئی ممتاز ادبی شخصیتیں ہمارے درمیان سے اُٹھ گئیں، جن میں انتظار حسین، جوگندر پال، زبیر رضوی، ندا فاضلی، پروفیسر ملک زادہ منظور احمد، ڈاکٹر اسلوب احمد انصاری اور ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کے نام نمایاں ہیں۔ اقبال نے درست فرمایا ہے کہ۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

آپ نے اپریل ۲۰۱۶ء کے شمارہ میں میری دو غزلیں شائع کیں، بہت بہت شکریہ! اُردو کے مشاہیر غزل گو شعرا کے فن پر بھی مختلف قلمکاروں سے مقالات لکھوا کر شائع کرنے کی زحمت کریں، تاکہ نئی نسل ان حضرات کی شاعری سے مستفیض ہو سکے۔

مشتاق جاوید، کلکتہ

☆ "زبان وادب" جون ۲۰۱۶ء زیر مطالعہ ہے۔ اداریہ "ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے" پروفیسر شکیل الرحمٰن سابق وائس چانسلر متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ اور ممبر آف پارلیامنٹ کی ادبی خدمات اور شخصیات کو سمجھنے کے لئے کافی ہے۔ جناب مشتاق احمد نوری کا پروفیسر شکیل الرحمٰن صاحب سے کوسوں دور جا کر بار بار ملنا اور گورگاؤں میں ہی پہنچ کر اپنے دست مبارک سے انہیں انعام واعزاز سے نوازنا اپنے آپ میں بڑی بات ہے۔ مشہور کہنہ مشق شاعر ناشاد اورنگ آبادی صاحب کو بھی آپ نے اکیاون ہزار (-/51000) روپے اور اعزاز سے نوازا ہے۔ حال ہی میں مشتاق احمد نوری صاحب شاعر رضا اشک (سمستی پور) کی پٹنہ میں علالت کی خبر سن کر ملنے ہی نہیں آئے بلکہ علاج کے لئے نقد بیس ہزار (-/20000) روپے سے تعاون فرمایا۔ ہمدردی اور انسانیت کا ایسا نمونہ اب تک میری نظر سے نہیں گزرا۔ اکادمی کے کئی پروگراموں میں مشہور شاعر وادیب اور "کسوٹی جدید" کے مدیر انور شمیم کی شرکت میرے لئے باعث مسرت رہی ہے۔ شکیل الرحمٰن صاحب پر لکھا گیا ڈاکٹر مشتاق احمد کا مضمون اور پروفیسر عبدالسنان طرزی، مرتضیٰ اظہر رضوی، ڈاکٹر قمر رئیس بہرائچی اور شجاع الدین شاہد کی نظمیں وقیع اور فرحت بخش ہیں۔

قاسم صبا، سمستی پور

☆ "زبان وادب" تواتر سے مل رہا ہے۔ کبھی کبھی تو یہ طے کرپانا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان سب میں اچھا اور سب سے اچھا کون سا شمارہ ہے۔ مئی کے شمارے کا سرورق بہت خوب ہے، دیکھتے ہی رمضان المبارک کا احساس از خود ہونے لگتا ہے۔ اپریل ۲۰۱۶ء کے شمارے میں آپ نے محترمہ فرحت بانو کا مضمون "قومی یکجہتی کے علمبردار: سرسید احمد خاں" شائع کیا ہے۔ محترمہ نے "نیا دور" لکھنؤ کے حوالے سے یہ مضمون تیار کیا ہے۔ کچھ کوٹس ماخوذ کئے ہیں۔ کچھ جملے جو "نیا دور" اکتوبر ۲۰۱۳ء سے ماخوذ ہیں ان کے ساتھ منصفانہ سلوک نہیں برتا گیا ہے۔

صادق علی انصاری، سیتاپور

☆ "زبان وادب" ہر ماہ، وقت پر اپنی آب وتاب کے ساتھ شائع ہو کر تشنگان ادب کی سیرابی کر رہا ہے، بیشک رسالے کو معیاری بنانے میں آپ کوئی کمی نہیں رہنے دیتے۔ نظم ونثر، دونوں حصے لائق مطالعہ ہیں۔

PDF Compressor Free Version



ہر ماہ ''زبان وادب'' کی آمد کا انتظار رہتا ہے۔ آپ کے زیر نگرانی اردو اکادمی، اردو کی پزیرائی کے لئے کچھ نئے طریقے اختیار کر رہی ہے جو اردو کو صحت یاب ضرور کریں گے۔

اختر کاظمی، فتح پور، یوپی

☆ ''زبان وادب'' کا تازہ شمارہ ملا، بہت بہت شکریہ! آپ لوگوں کی کاوش واقعی قابل قدر ہے۔ میں دل کی عمیق گہرائیوں سے اکادمی کے ذمہ داروں کو ان کی اس مثالی کاوش کے لئے مبارکباد دیتا ہوں۔ پروفیسر شکیل الرحمٰن مرحوم کا آپ نے حق ادا کردیا۔ بیشک ان کا شمار اردو کے صف اوّل کے ادیبوں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اردو اور فارسی ادبیات کے کلاسیکی سرمائے کا بطور خاص مطالعہ کیا اور اپنے مطالعات کا حاصل متعدد مقالات اور مطبوعات کی صورت میں پیش کیا ہے۔ انہوں نے جہاں رومیؔ، حافظؔ اور امیر خسروؔ کے متعلق اہم کتابیں تصنیف کیں، وہیں میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ اور اختر الایمان کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزاد اور پریم چند کے فکر و فن کا بھی مطالعہ کیا اور ان پر علیحدہ علیحدہ کتابیں لکھیں۔ ان کی وفات سے اردو ادب میں ایسا خلا پیدا ہوا ہے جو تادیر پر نہیں ہوگا۔

(ڈاکٹر) سید اشرف اسمٰعیل، صادق پور، پٹنہ

☆ ''زبان وادب'' جون ۲۰۱۶ء کا شمارہ پیش نظر ہے۔ شمارہ کیا ہے کہ جناب شکیل الرحمٰن پر ایک دستاویز ہے۔ شمارہ شروع سے آخر تک پڑھ گئے اور ان کی ہمہ جہت شخصیت نظروں کے سامنے گھومتی رہی مقالہ نگاروں نے اپنے اپنے خیالات کے مطابق ان کے روشن حالات زندگی ادبی اور تاریخی فانوس میں سجادئے ہیں جو مبارکباد کے مستحق ہیں۔ رسالہ بہتر سے بہتر ہوتا جارہا ہے اور اعلیٰ اعلیٰ مضامین اور منظومات سامنے آتے جارہے ہیں۔ یہ سب آپ کی محنت کا پھل ہے۔ ''بچوں کا زبان وادب'' بھی نکھرتا جارہا ہے۔

اسلام احمد شاہی، بھاگلپور

☆ عید سعید کی مبارکباد کے ساتھ ''زبان وادب'' جولائی ۲۰۱۶ء ملا۔ ''حرف آغاز'' میں جوگندر پال کی یادوں پر آپ کی تحریر اور پھر پال صاحب پر ترتیب دیے گئے گوشے کے مضامین خاصے معلوماتی ہیں۔ ''مقالات'' کے تحت بھی بہت اچھی تحریریں آپ نے یکجا کردی ہیں۔ نگہت تسیم کا افسانہ ''کر بلے'' خصوصیت سے پسند آیا۔ ''منظومات'' کے حصے بھی خاصے ثروت مند ہیں۔ ''بچوں کا زبان وادب'' میں ''عید'' پر فاطمہ جبیں کی نظم بہت اچھی لگی۔ اس حصے کی سبھی کہانیاں بھی دلچسپ اور بچوں کے لئے سبق آموز ہیں۔

گل آفرین، مظفر پور

## کماؤپوت (ص ۴۲ سے آگے)

اس سے اس کے خواب، اس کی امیدیں اور آس چھین کر اسے تنہا کردیا ہے۔ کراہنے کا وقت نہیں تھا۔ ان حالات کے شکار ہمارے جیسے نوجوان اکثر ہوتے رہتے ہیں۔ ذمہ دار کون ہے؟ یہ کہنا مشکل بھی ہے اور تکلیف دہ بھی۔ بس انہیں وقتی سہارے کی ضرورت ہوتی ہے، پھر وہ اٹھ بھی جاتے ہیں، میری طرح۔ مجھے اس درد کا اندازہ بھی ہے اور اسے میں نے سہا بھی ہے، مگر کیا عبدل جیسے انسان کو اس کا اندازہ ہے؟ جو صرف اخلاقیات کا درس دے کر اس سماج میں رہنے کی اپنی ذمہ داری کا بوجھ ہم جیسے لوگوں پر اتار کر سرخرو ہوتے ہیں۔ ❀❀

## خریداروں کے لئے ضروری اطلاع

☆ محکمہ ڈاک نے انڈر پوسٹنگ سرٹیفکیٹ سسٹم ختم کردیا ہے، لہٰذا خریدار حضرات کو اب سادہ ڈاک سے رسالہ بھیجا جاتا ہے۔ رسالہ کی گمشدگی کے لئے ادارہ پر کسی طرح کی کوئی ذمہ داری اور باز پرس نہیں ہوگی۔ اگر رجسٹرڈ پوسٹ سے رسالہ منگانا چاہتے ہوں تو اس کے لئے زر سالانہ ۳۵۰ روپے ہوگا۔

☆ اس دائرے میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوچکی ہے۔ اگر اگلے سال کا زر سالانہ آپ سے موصول نہیں ہوا تو یہ سمجھا جائے گا کہ آپ آگے خریدار بنے رہنا نہیں چاہتے۔ (سرکولیشن انچارج)

PDF Compressor Free Version

# بچوں کا
# زبان وادب


| | | | |
|---|---|---|---|
| ☆ | مگرمچھ کا شکار | ڈاکٹر بانو سرتاج | ۷۴ |
| ☆ | سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا | فراغ روہوی | ۷۶ |
| ☆ | ساون آیا، ساون آیا | ڈاکٹر رام داس ناداؔر | ۷۷ |
| ☆ | جامن کا درخت | احمد رضوان | ۷۸ |
| ☆ | سچی مدد | امین احمد انصاری | ۷۹ |
| ☆ | آزادی | جوہرؔ توری | ۷۹ |
| ☆ | ''ا'' سے ''ی'' تک | م۔ آصف آروی | ۸۰ |


✿✿✿

PDF Compressor Free Version

ڈاکٹر بانو سرتاج
Opposite Akashwani, Civil Line
Chandrapur 442401 (M.S.) (Mob. 9423418497)

# مگرمچھ کا شکار

ایک گاؤں میں ایک تالاب تھا۔ تالاب بہت بڑا نہیں تھا، مگر گاؤں والوں کی ضروریات کے لئے کافی تھا۔ گاؤں کی عورتیں وہاں کپڑے دھوتیں، کسان مویشیوں کو پانی پلاتے، نہلاتے دھلاتے۔

ایک دفعہ غضب ہو گیا۔ کہیں سے آ کر ایک مگرمچھ نے تالاب کو مسکن بنالیا۔ آئے دن جانوروں کا شکار کرنے لگا۔ بڑے جانور تو بچ کر نکل جاتے، مگر چھوٹے جانور، بکریاں وغیرہ اس کا لقمہ بن جاتے۔

گاؤں والے پریشان ہو گئے۔ عورتیں تالاب پر کپڑے دھونے کے لئے جانے میں ڈرنے لگیں۔ کسان مویشیوں کو گاؤں سے باہر دوسرے تالاب پر لے جانے لگے۔ مگرمچھ کو مارنے کے لئے ترکیبیں سوچی جارہی تھیں کہ مگرمچھ نے اپنا پہلا انسانی شکار کرلیا۔

کسی دوسرے گاؤں سے ایک شخص گاؤں میں آیا۔ تھکا ہارا تھا، سوچا، ہاتھ منھ دھوکر تازہ دم ہو جاؤں، پھر رشتہ دار کے گھر پہنچوں۔ تالاب میں قدم رکھا تھا کہ مگرمچھ نے ٹانگ پکڑلی۔ وہ گھبرا گیا اور زور زور سے چیخنے لگا۔ گاؤں والے دوڑے دوڑے آئے۔ وہ بھی جوان آدمی تھا سنبھل کر مقابلہ کرنے لگا۔ گاؤں والوں کی مدد سے وہ کسی طرح بچ گیا، مگرمچھ اس کی ٹانگ کا گوشت نوچ لے گیا تھا۔

گاؤں والے مستعد ہو گئے۔ جی جان سے جٹ گئے، مگر وہ کسی طرح قابو میں نہ آتا تھا۔ بھالوں، تلواروں سے مارنے کی کوشش کی گئی، مگر سب فضول! بھالوں کی نوکیں مڑ گئیں، تلواریں ٹوٹ گئیں، جال کٹ گئے، مگرمچھ مارا نہ گیا۔ حفاظتی اقدامات کے تحت گاؤں والوں نے جانوروں کو باڑے میں بند کر کے رکھنا شروع کر دیا۔ مگرمچھ نے بھوک سے بے تاب ہو کر انتہائی قدم اٹھایا۔ رات کے اندھیرے میں باڑے تک پہنچ کر مویشیوں کا شکار کرنے لگا۔ گاؤں والے بوکھلا گئے۔

ایک رات چوپال میں گاؤں والے سر جوڑ کر بیٹھے۔ طے یہ ہوا کہ گاؤں کے کھیا شہر جا کر کلکٹر سے مل کر مگرمچھ کے خاتمہ کے لئے مدد کی درخواست کریں۔

''کھیا جی.....'' یکا یک اکمل نامی ایک نوجوان نے کہا:

''میری اماں کہتی ہیں کہ ان کے بتائے ہوئے طریقہ سے مگرمچھ کو مارا جاسکتا ہے۔''

''کون کہتی ہیں؟'' کھیا نے پوچھا:

''اللہ رکھی چاچی.....؟''

''ارے تو فوراً انہیں یہاں بلاؤ۔''

اللہ رکھی ایک عمر رسیدہ خاتون تھیں۔ کسی کو بھی ان کے اس دعویٰ پر ہنسنے کی جرأت نہ ہوئی بلکہ فوراً انہیں وہاں بلا لیا گیا۔ کھیا نے پوچھا:

''واقعی چاچی، آپ مگرمچھ کو مار سکتی ہیں؟''

''کوشش کر سکتی ہوں۔''

''بھلا پہلے کیوں نہ بتایا چاچی؟'' ایک شخص نے کہا

''کسی نے مجھ سے پوچھا؟''

چاچی ہنس کر بولیں:

''ہم عورتوں کو تم لوگ کچھ سمجھتے بھی کہاں ہو؟ میں عورت پھر بڑھیا.....''

''نہیں چاچی، اب ایسا بھی نہیں ہے۔ تم بڑھیا ہو، عقل کی پڑیا ہو، ہم سب نادان ہیں۔ بتاؤ کیا کریں؟ کیسے اس موذی کا خاتمہ کریں؟'' ایک نوجوان نے پرمذاق لہجے میں کہا۔

''کل تم لوگ مجھے ایک بوری چونا لا دو۔ میں اور اکمل سب کرلیں گے..... ہاں شہر جانے کی بات پرسوں پر رکھو، میں کامیاب نہ ہوئی

PDF Compressor Free Version



تو پرسوں بیشک جانا۔"

دوسرے دن دوپہر کے بعد چاچی اللہ رکھی کام میں مصروف ہوگئیں۔ شام کا جھٹپٹا ہوتے ہی اکمل کے ساتھ وہ تالاب پر پہنچ گئیں۔ تالاب کا پانی پرسکون تھا، مگر مچھ یقیناً کہیں گہرائی میں آرام کر رہا تھا۔ اکمل کے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا۔ اللہ رکھی بکری کے ایک بچے کو گود میں اٹھائے ہوئے تھیں۔

اکمل نے تھیلے میں سے بکری کے مردہ بچے کو نکالا۔ اسے پیڑ کے نیچے رکھ کر وہ اوپر چڑھ گیا۔ نیچے رسی پھینکی جسے چاچی نے دوسرے بچے کی کمر کے گرد باندھ دیا اور پھر وہ تیزی سے پیچھے ہٹ کر اندھیرے میں گم ہوگئیں۔ بکری کا بچہ چلانے لگا۔

چند لمحوں بعد ہی پانی میں ہلچل ہوئی، مگر مچھ نے پانی کے اوپر سر نکالا۔ بکری کا بچہ مسلسل چلا رہا تھا۔

مگر مچھ پانی سے نکلا، آہستہ آہستہ بکری کے بچے کی طرف بڑھا۔ دیکھتے دیکھتے اس کی رفتار تیز ہوگئی۔ اکمل نے آہستگی سے بکری کے زندہ بچے کو رسی سمیت اوپر کھینچ لیا۔

مگر مچھ تیزی سے آگے بڑھا اور پیڑ کے نیچے رکھے بچے کو نگل کر پانی میں گھس گیا۔

اکمل تیزی سے پیڑ سے اتر گیا۔ گود میں سنبھالے ہوئے بچے کو اس نے اللہ رکھی چاچی کی گود میں دے دیا۔

بکری کا بچہ خوف سے سہما ہوا تھا۔

"اب تم گاؤں والوں کو بلا سکتے ہو۔"

چاچی نے آہستہ سے کہا۔ اکمل گاؤں کی طرف دوڑ پڑا۔ لالٹین لے کر وہ سب آگئے۔

تھوڑی ہی دیر بعد تالاب کے پانی میں جیسے طوفان آگیا۔ مگر مچھ پانی میں الٹ پلٹ ہو رہا تھا۔ لالٹین کی روشنی میں سارا تماشہ صاف نظر آ رہا تھا۔

"یہ تو ایسے تڑپ رہا ہے جیسے اس کے پیٹ میں آگ لگ گئی ہو۔" ایک نے کہا۔

چاچی ہنس کر بولیں:

"آگ ہی تو لگی ہے۔ سیروں سیر چونا کھایا ہے اس نے؟"

"چونا.....؟ چونا بھلا کیسے کھایا.....؟ کیسے پہنچا اس کے پیٹ میں چونا.....؟"

"بکری کے بچے کے پیٹ میں تھا۔"

"کس نے رکھا؟"

میں نے رکھ کر پیٹ سی دیا تھا۔"

"بکری کا بچہ کہاں تھا؟"

"پیڑ کے نیچے۔"

لوگ سوال پر سوال کر رہے تھے۔ اللہ رکھی چاچی نے جو کچھ بتایا اسے سن کر سب حیران رہ گئے۔"

چاچی نے اپنے گھر کی بکری کے ایک بچے کی قربانی دی۔ اکمل نے پیٹ چیر کر صاف کیا اور اس میں چونا بھر دیا۔ چاچی نے سوئی دھاگے سے پیٹ سی دیا۔

تالاب کے کنارے بکری کے مردہ بچے کے ساتھ زندہ بچے کو رکھا گیا۔ اس کے پیٹ میں بندھی ہوئی رسی کا سرا اکمل کے ہاتھ میں تھا۔ بکری کا بچہ خوف سے چلا رہا تھا، مگر مچھ نے گھات لگائی۔ اکمل نے زندہ بچے کو اوپر کھینچ لیا۔ مگر مچھ نے مردہ بچے کو نگل لیا۔ اس نے بچے کی آوازیں سنی تھیں۔ آنکھیں بند کر کے حملہ کر دیا۔ بوکھلاہٹ میں اسے احساس ہی نہیں ہوا کہ اس نے مردہ بچے کو نگلا ہے۔

پیٹ میں پہنچتے ہی سلائی کے کچے دھاگے ٹوٹ گئے مگر مچھ کے پیٹ میں جلن ہونے لگی.....اس نے گھبرا کر ڈھیر سا پانی پی لیا۔ چونا کھولنے لگا، مگر مچھ تڑپنے لگا۔"

"اور اب دیکھو۔ تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو چکا ہے۔"

چاچی نے کہانی ختم کی۔

گاؤں والوں نے چاچی کو بکری کے بچے کی قیمت ادا کرنی چاہی، مگر انہوں نے "یہ تو میرا فرض تھا" کہہ کر قیمت لینے سے انکار کر دیا۔ گاؤں کے بچے بڑے اب اللہ رکھی کو ہیروئن چاچی کہہ کر پکارتے ہیں۔

PDF Compressor Free Version

فراغ روہوی

67, Maulana Shaukat Ali Street (Colootola Street)
Kolkata 700073 (Mob.: 9831775593)

# سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

وطن سے محبت فطری بات ہے۔ ہر انسان کو اپنے وطن سے محبت ہوتی ہے۔ اس عقیدت و محبت کی بنا پر اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے وطن کو سارے جہاں سے اچھا سمجھے، بلکہ دنیا کا ہر شخص اپنے وطن کو سارے جہاں سے اچھا سمجھتا ہے۔ چاہے وہ ملک کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو، وہاں کے لوگوں کو سارے جہاں سے اچھا لگتا ہے۔ انہیں اپنا ملک سارے ملکوں سے اچھا لگنا ہی چاہیے، کیوں کہ اُس ملک میں وہ پیدا ہوئے ہیں۔ وہ ملک ان کے آباواجداد کا ملک ہے، لہٰذا اُس ملک سے اُن کا جذباتی لگاؤ ہونا لازمی ہے۔

شاعر مشرق علامہ اقبالؔ نے محض عقیدت و محبت کی بنیاد پر اپنے وطن کو سارے جہاں سے اچھا نہیں کہا۔ وہ روشن خیال انسان تھے۔ وہ ایک عظیم شاعر کے علاوہ مفکر اور فلسفی بھی تھے۔ انہوں نے اپنے وطن کو سارے جہاں سے اچھا کہنے سے پہلے غور سے سو بار سوچا، اپنے وطن کے گوشے گوشے کا باریک بینی سے جائزہ لیا، اپنے وطن کی معاشرتی، تہذیبی اور ثقافتی روایات کے تمام پہلوؤں پر سنجیدگی سے نظر ڈالی، تب انہوں نے پورے اعتماد کے ساتھ اپنے وطن کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' کہا۔

یقیناً ہمارا ملک سارے جہاں سے اچھا ہے، کیوں کہ ہمارے ملک میں بھانت بھانت کے لوگ بستے ہیں۔ بھانت بھانت کی بولیاں بولی جاتی ہیں۔ یہاں کے لوگوں کی طرزِ رہائش بھی جدا جدا ہے اور پہناوا بھی الگ الگ۔ یہاں ہندو بھی بستے ہیں اور مسلمان بھی، سکھ بھی، جینی بھی، عیسائی بھی، پارسی بھی، یہودی بھی اور بودھ مذہب کے ماننے والے بھی۔ یہ ملک دیوی دیوتاؤں کا ملک ہے۔ سادھو سنتوں کا ملک ہے، پیر فقیروں کا ملک ہے۔ یعنی رام کا بھی، چشتی کا بھی، نانک اور بودھ وغیرہ کا بھی۔ اس ملک میں ہر مذہب کے ماننے والوں کو اپنے اپنے ڈھنگ سے زندگی گزارنے کا اختیار حاصل ہے۔ یہاں کے مندروں میں اگر صبح و شام سنکھ اور گھنٹوں کی آواز گونجتی ہے تو یہاں کی مسجدوں میں بھی پانچ وقت صدائے اذان بلند ہوتی ہے۔

ہمارا ملک اس اعتبار سے بھی سارے جہاں سے اچھا ہے کہ یہاں کی آب و ہوا اور موسم بھی جدا جدا ہے۔ کہیں سردی پڑتی ہے تو کہیں گرمی، کہیں بارش ہوتی ہے تو کہیں برف باری۔ اس ملک میں کہیں ہرے بھرے کھیت دیکھنے میں آتے ہیں تو کہیں ریگ زار، کہیں سرسبز وادی دکھائی دیتی ہے تو کہیں بنجر زمین، کہیں بڑے بڑے ٹیلے نظر آتے ہیں تو کہیں چٹیل میدان، کہیں ندی نالے بہتے ہیں تو کہیں بڑے بڑے دریا، کہیں مچلتے ہوئے آبشار دکھائی دیتے ہیں تو کہیں ٹھہری ہوئی خاموش جھیل، کہیں چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں سر اٹھائے کھڑی ہیں تو کہیں بڑے بڑے پہاڑ اور ہمالہ جیسا بلند و بالا پہاڑ تو ہماری پاسبانی پر مامور ہے۔

ہمارا ملک اس لحاظ سے بھی سارے جہاں سے اچھا ہے کہ یہ ملک خود کفیل ہے۔ یہاں روزمرہ استعمال میں آنے والے ہر طرح کے غلوں کی کاشت ہوتی ہے۔ طرح طرح کے پھول اور خشک میوے بھی اُگائے جاتے ہیں۔ ہر قسم کے مسالہ جات، تیل، نمک، چینی سے لے کر چائے اور کافی تک پیدا کیے جاتے ہیں۔ یہاں کی زمین کے اندر تیل اور پٹرول کے علاوہ کوئلہ، ابرق، لوہا، تانبا، پیتل وغیرہ کا بھی بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ یہ چیزیں ہمارے مختلف شعبۂ حیات میں ہر روز کام آتی ہیں۔ یہاں کپڑوں، چرمی مصنوعات، ریل اور موٹر گاڑیوں کے علاوہ جدید ترین الیکٹرونک ساز و سامان بھی تیار کیے جاتے ہیں۔ یہ ملک کل بھی سونے کی چڑیا تھا اور آج بھی ہے۔

PDF Compressor Free Version



ہمارا ملک اس نقطہ نظر سے بھی سارے جہاں سے اچھا ہے کہ یہاں دنیا کی قدیم ترین یونیورسٹیوں میں شمار ہونے والی نالندہ یونیورسٹی کے نشانات کھنڈر کی صورت میں آج بھی موجود ہیں۔ دنیا کا ساتواں عجوبہ یعنی محبت کی بے مثال نشانی تاج محل بھی یہیں ہے اور اجنتا ایلورا بھی۔ جنہیں دیکھنے کے لیے دنیا بھر کے سیاح دیوانہ وار کھنچے چلے آتے ہیں۔ شروع سے ہی ہمارا ملک سارے عالم کی نگاہوں کا محور و مرکز رہا ہے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو غیر ملکی لوگ یہاں قدم رکھنے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ اس ملک کی مقناطیسی کشش نے انہیں نہ صرف یہاں تک آنے پر مجبور کیا بلکہ حکمرانی کرنے پر بھی اکسایا۔ انہوں نے اس ملک میں سینکڑوں برس حکومت کی، لیکن اس ملک کی غیرت مند ماؤں نے ایسے ایسے سورماؤں کو جنم دیا جنہوں نے غیر ملکی حکمرانوں کی بنیاد ہلا کر اینٹ سے اینٹ بجادی۔ مجبوراً انہیں اس سرزمین کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑنا پڑا۔ انہیں سورماؤں کی عظیم الشان قربانیوں کی بدولت آج ہم سب ملک کی آزاد فضا میں سر اٹھا کر جی رہے ہیں اور فخر سے کہتے ہیں:

''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا''

❁❁❁

ڈاکٹر رام داس نادار

20/30 Moti Nagar, New Delhi 110015 (Ph. 25012289)

# ساون آیا، ساون آیا

ساون آیا ، ساون آیا
ہر اک کا من بھاون آیا

جھول رہے ہیں پینگیں سارے
سبھی کے ہیں وارے نیارے

کالے کالے بادل آئے
بارش لائے ، بارش لائے

لو اب چھم چھم مینھ ہے برسا
کوندی بجلی ، بادل گرجا

بھاگ چلو اب گھر کو بھائی
میں بھی نہیں ہوں چھاتا لائی

بھیگ گیا ہے میرا بستہ
پہلے سے ہے بھاری لگتا

بھیگ گئی ہوں میں بھی ساری
ٹھنڈی لگتی ، میں بھی ہاری

آنکھیں کھولے چلنا بھائی
آگے لگتی مجھ کو کھائی

گھبرانا مت گھر آ پہونچا
دیکھ لیا ہے آج تماشہ

رکھ دو تم بھی اپنا بستہ
کاٹ لیا ہے جوں توں رستہ

بدلو کپڑے ، پی لو چائے
ماں سے کہو کہ کچھ تو کھلائے

❁❁❁

PDF Compressor Free Version



احمد رضوان
ٹورانٹو کینیڈا

# جامن کا درخت

گھر کے آنگن میں لگائے گئے سب پودے سوکھ جاتے تھے جانے کیوں، پھر ہمارے عزیز بزرگ نے اپنے پیارے ہاتھوں سے اک جامن کا پودا لگایا اور کچھ ہرا بھرا ہونے پر اس کے گلے میں سنہرے رنگ کا ایک تعویز آویزاں کر دیا جس کی برکت سے وہ بھی میرے ساتھ جوان ہونے لگا۔ وہ اتنا خوش قامت ہو گیا کہ ہر کوئی اسے رشک کی نظر سے دیکھنے لگا۔ جامن کا درخت میری زندگی کا حصہ بنتا چلا گیا میں نے کئی چمپئی صبحیں، روپہلی دوپہریں، سرمئی شیتل سی شامیں اس کے سائے اور سنگت میں گزاریں۔

میں اس کے دوشاخہ تنے پر بیٹھ کر بچوں کی کتھائیں پڑھتا تھا۔ سندباد، عمرو عیار اور ٹارزن سے میرا تعارف اسی دوشاخہ تنے پر ہوا تھا۔ جنوں سے ڈرنا بھی میں نے یہیں سیکھا تھا، خیالات کی پریاں جامن کے درخت کا طواف کرتی تھیں۔ میں نے بارہا ان کی ساحرانہ ہنسی اور آٹھویں سر میں گندھی سرگوشیاں سنی تھیں، مجھے ان کی زبان سمجھ میں نہیں آتی تھی، مگر میرا کمسن وجدان یہ جانتا تھا کہ پریاں کوئی بھی زبان بولتی ہوں، مگر جھوٹ نہیں بولتیں، پھر کہانی میں جدائی کا موڑ آ گیا، مجھے تعلیم مکمل کرنے کے بعد رزق کی جستجو میں نکلنا پڑا، مجھے یک نئی دنیا دریافت کرنا تھی اور نئی دریافت قربانی مانگتی ہے۔

میں اپنا بچپن جب جامن کے درخت کے تنے کے ساتھ باندھ کر رخصت ہونے لگا، تو میں نے شبنمی آنکھوں سے مڑ کر اپنے دیرینہ دوست کو دیکھا۔ وہ خاموش کھڑا مجھے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ساکن پتے بتا رہے تھے کہ وہ بھی اداس ہے۔ وہ میرے ساتھ نہیں آ سکتا تھا وہ چل نہیں سکتا تھا، اس کے پاؤں زمین نے محبت سے تھام رکھے تھے۔ اس کی زندگی کا ایک ہی مقصد تھا سایہ اور پھل بانٹنا، مگر میرے کچھ اور بھی مقاصد تھے، خواہشیں تھیں، ضرورتیں تھیں اس لیے اسے چھوڑ کر چل پڑا۔

آج کئی سال بعد جب جوانی رخصتی مانگ رہی ہے اور بالوں میں چاندی اتر آئی ہے تو کسی نے خبر دی ہے کہ میرا جامن کا درخت کاٹا جا چکا ہے اسے تازہ ہوا بانٹنے کے جرم میں سزا دے دی گئی۔ وہ کسی کی راہ میں حائل ہونے لگا تھا، اس لئے اسے کسی انقلابی کی طرح راستے سے ہٹا دیا گیا، اسے زمین سے عاق کر دیا گیا۔ میرے علاوہ اس کے کٹنے کا دکھ صرف پرندوں کو ہوا ہوگا۔ یہ خبر سن کر میں سوچ رہا ہوں، کاش! یہ خبر مجھے جامن کے درخت کے کٹنے سے پہلے مل جاتی یا تھوڑی مہلت مل جاتی تو میں اس کی شاخ کاٹ کر پیوند کاری کر کے اسے بھی اپنے نئے آنگن میں لگا لیتا کہ پھر میرے بچے اس کے ساتھ جوان ہوتے اور میں اپنا بڑھاپا اس کی قربت میں گزارتا۔ میں اسے بتاتا کہ کردار بوڑھے نہیں ہوتے ہم بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ لوریاں کمسن رہتی ہیں، سننے والے عمر رسیدہ ہو جاتے ہیں۔ میں اسے اپنی کتھائیں، نظمیں سناتا، پرانی یادیں تازہ کرتا اور وہ چپ چاپ کھڑا جھوم جھوم کر داد دیتا، داد کیوں نہ دیتا آخر وہ میرا پیارا لنگوٹیا جامن کا درخت تھا۔ ❁❁

## حضرت علی نے فرمایا

عزیزوں سے حسن سلوک مال کی فراوانی اور عمر کی درازی کا سبب ہے اور پوشیدہ طور پر خیرات کرنا گناہوں کا کفارہ۔ لوگوں پر احسانات کرنا ذلت اور رسوائی کے مواقع سے محفوظ رکھتا ہے۔ اللہ کے ذکر میں بڑھے چلو اس لئے کہ وہ بہترین ذکر ہے اور اس چیز کے خواہشمند بنو جس کا اللہ نے پرہیزگاروں سے وعدہ کیا ہے اس لئے کہ اس کا وعدہ سب وعدوں سے زیادہ سچا ہے۔ نبی کی سیرت کی پیروی کرو کہ وہ بہترین سیرت ہے اور ان کی سنت پر چلو کہ وہ سب طریقوں سے بڑھ کر ہدایت کرنے والی ہے اور قرآن کا علم حاصل کرو کہ وہ بہترین کلام ہے اور اس میں غور و فکر کرو کہ یہ دل کی بہار ہے اور اس کے نور سے شفا حاصل کرو کہ سینے کے اندر چھپی ہوئی بیماریوں کے لئے وہ شفا ہے اور اس کی خوبی کے ساتھ اس کی تلاوت کرو کہ اس کے واقعات سب واقعات سے زیادہ فائدہ رساں ہیں۔

PDF Compressor Free Version



امین احمد انصاری

''کبیریہ اردو مڈل اسکول'' ذاکر نگر، آزاد نگر، جمشید پور832110

# سچی مدد

ایک ننھا پرندہ اُڑان بھرنے کی کوشش کرتا، لیکن بار بار کچھ اوپر اُڑ کر نیچے گر جاتا۔ دور سے ایک اجنبی پرندہ اپنے دوست کے ساتھ بیٹھا یہ سب غور سے دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ اس کے قریب پہنچا اور بولا:

''کیا ہوا، بہت پریشان ہو؟''

''مجھے شام ہونے سے پہلے اپنے گھونسلے تک لوٹنا ہے۔ اُڑان بھرنا ابھی ٹھیک سے نہیں آتا۔ کیا آپ مجھے اُڑنا سکھا سکتے ہیں؟''

''جب سیکھا نہیں تو اتنی دور نکل آنے کی کیا ضرورت تھی؟''

وہ ننھے پرندے کا مذاق اُڑانے لگا، پھر ہنستے ہوئے بولا:

''دیکھو، ہم تو اڑان بھرنا جانتے ہیں اور اپنی مرضی سے کہیں بھی جاسکتے ہیں۔'' اتنا کہہ کر اس نے ننھے پرندے کے سامنے پہلی اڑان بھری، پھر تھوڑی دیر بعد لوٹ آیا اور دو چار تلخ باتیں کہہ کر پھر اڑ گیا۔ ایسا اس نے چار پانچ بار کیا، لیکن اگلی بار جب وہ واپس لوٹا تو ننھا پرندہ وہاں نہیں تھا۔ یہ دیکھ کر اجنبی پرندہ خوش ہوتے ہوئے اپنے ساتھی سے بولا:

''آخر اس ننھے پرندے نے اُڑان بھر ہی لی۔''

اس کا ساتھی بولا: ''لیکن تم اتنا خوش کیوں ہو رہے ہو؟ تم نے تو اس کتنا مذاق اڑایا۔''

''اصل میں یہ اسے اڑنا سکھانے کا ایک طریقہ تھا۔ میں اس کے لئے اجنبی تھا۔ میں اسے سیدھے طریقے سے اڑنا سکھاتا تو وہ پوری زندگی میرے احسان تلے دبا رہتا۔ اسے دوسروں سے مدد مانگنے کی عادت پڑ جاتی۔ جب میں نے اسے کوشش کرتے ہوئے دیکھا، تبھی سمجھ گیا تھا کہ اسے بس تھوڑی سی تربیت دینے کی ضرورت ہے اور میں نے بار بار اس کے سامنے اُڑ کر اسے تربیت دے دی۔ اب وہ خود اڑتا رہے گا اور دوسروں سے کبھی مدد نہیں مانگے گا۔ سچی مدد وہی ہے جو مدد پانے والے کو یہ محسوس ہی نہ ہونے دے کہ اس کی مدد کی گئی ہے۔''

## آزادی

جوہر نوری

Moh. Chowdhriana,
Arrah 802301

یہی وہ دن ہے کہ پائی تھی جس میں آزادی
یہی وہ دن ہے کہ مسرت کی تھی گھٹا چھائی

یہی وہ دن ہے جو آیا نئی کرن لے کر
یہی وہ دن ہے دکھائی خوشی کی جس نے لہر

یہی وہ دن ہے کہ جھنڈا جہاں میں لہرایا
یہی وہ دن ہے غلامی کا مٹ گیا سایا

یہی وہ دن ہے جو پیغام امن لایا تھا
یہی وہ دن ہے کہ ہر سو خوشی کا سایا تھا

یہی وہ دن ہے فلک نے بھی پھول برسائے
یہی وہ دن ہے کہ غم نے اٹھا لئے سائے

اب آپ آئیں کہ مل جل کر احترام کریں
خوشی منائیں خوشی کا بھی انتظام کریں

خدا کرے کہ ہر اک سال یہ خوشی آئے
زمین شعر میں جوہر کمال دکھلائے

م۔ آصفؔ آروی

C/o Dr. Jamil Ahmad, Islam Nagar, Ward No. 27

Araria (Mob. 9386236634)

# ‘‘ا’’ سے ‘‘ی’’ تک

‘‘ا’’ سے اللہ ‘‘ب’’ سے بچو بہت بڑا وہ طاقت ور ‘‘پ’’ سے پیدا کیا اسی نے فلک زمین و شمس و قمر

‘‘ت’’ سے ہے تعریف کے لائق ‘‘ث’’ سے ثانی نہیں ہے اس کا ‘‘ج’’ سے جگمگ حکم سے اس کے جگنو کرتے شاخ و شجر

‘‘چ’’ سے چاندی چاند بھی ہوگا ‘‘ح’’ سے حجر ہے یعنی پتھر ‘‘خ’’ سے خدا ہے اس کا خالق اسی کے آگے جھکے گا سر

‘‘د’’ سے دیکھو ‘‘ڈ’’ سے ڈالی سجی ہوئی ہے پھولوں سے ‘‘ذ’’ سے ذات اکیلی ہے وہ پھول سے پیدا کرے ثمر

‘‘ر’’ سے روٹی ‘‘ز’’ سے زمانہ اسی کی کھاتا ہے پیارے ‘‘س’’ سے سب کا اَن داتا ہے، حیواں ہوں یا جن و بشر

‘‘ش’’ سے شاکر ‘‘ص’’ سے صابر اس کا پیارا ہوتا ہے ‘‘ض’’ سے ضدی انسانوں کا نہیں ہے اس کے پاس گزر

‘‘ط’’ سے طلب کو ‘‘ظ’’ سے ظاہر خدا سے کرنی لازم ہے ‘‘ع’’ سے علم و عقل نہیں تو جاہل کھوجے دوجا گھر

‘‘غ’’ سے غافل ‘‘ف’’ سے فرصت بھلا ملے گی کب تجھ کو ‘‘ق’’ سے قرآں کہے مجھے بھی بہر تلاوت کھولا کر

‘‘ک’’ سے کوئی ‘‘گ’’ سے گالی ناحق بکے تو صبر کرو ‘‘ل’’ سے لڑنا بہت برا ہے جس کی گالی اس کے سر

‘‘م’’ میری ‘‘ن’’ سے نصیحت یہی ہے تم سے، پڑھا کرو ‘‘و’’ سے ورنہ ہاتھ ملو گے، خدا کی لعنت جاہل پر

‘‘ہ’’ سے ہمت ‘‘ی’’ سے یارو ہارنے والا بزدل ہے بزدل کا پھر کہاں ٹھکانا، غرق کرے گا اس کو ڈر

معنی مطلب اسی سے قائم آصفؔ اردو زبان کے اندر

جملہ جملہ دیکھ رہے ہو ہمزہ پیش و زیر و زبر